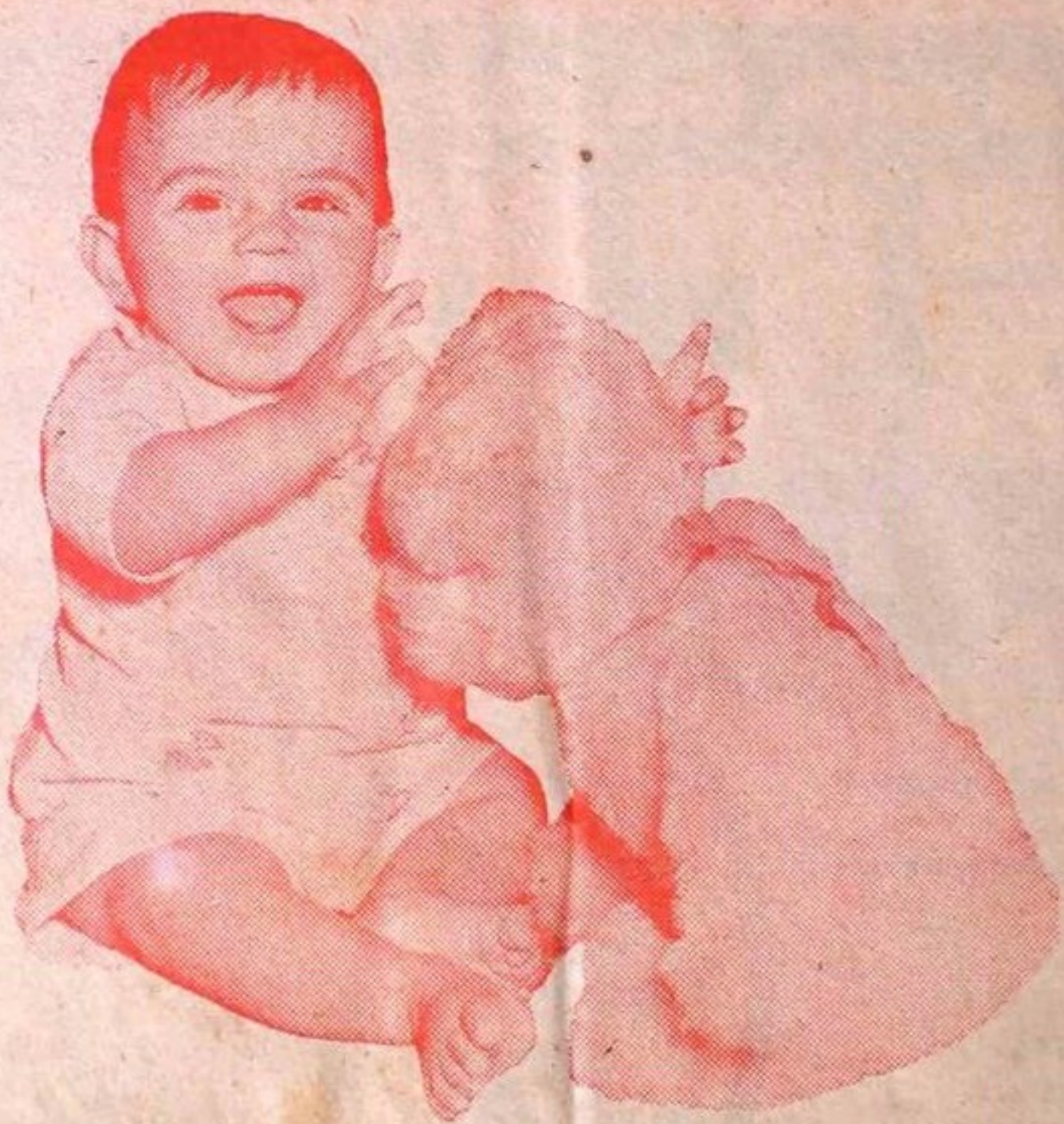




ہنسی خوشی کھیلتا ہے.... آرام سے سوتا ہے!

آپ ہاں گلیکسو پینے والے بچے تندرست، ممتحن اور مہنس مکھ ہوتے ہیں۔ آپ بھی اپنے بچے کو گلیکسو رکھیں۔ گلیکسو ایک خالص اعلیٰان بخش اور آزمودہ دودھ ہے جو پشنتہا پشت سے پورے اعتماد کیساتھ دیا جا رہا ہے۔ اس میں وٹامن ڈی اور فولاد شامل ہیں تاکہ بچوں کی ہڈیاں اور دانت مضبوط ہوں اور وہ خون کی کمی (انیمیا) سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر آپ صحیح طور پر اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتیں تو گلیکسو پر اعتماد کیجئے۔ آپ خوش ہوگی کہ آپ نے گلیکسو تجویز کر کے اپنے بچے کیلئے ایک صحیح خوراک کا انتخاب کیا۔



بچوں کے لئے کتنا
عمدہ دودھ ہے

گلیکسو

گلیکسو لیبارٹریز (پاکستان) لمیٹڈ، کراچی۔ لاہور۔ چٹاگانگ۔ ڈھاکہ

Build with the strength of

SCOOP
STEEL

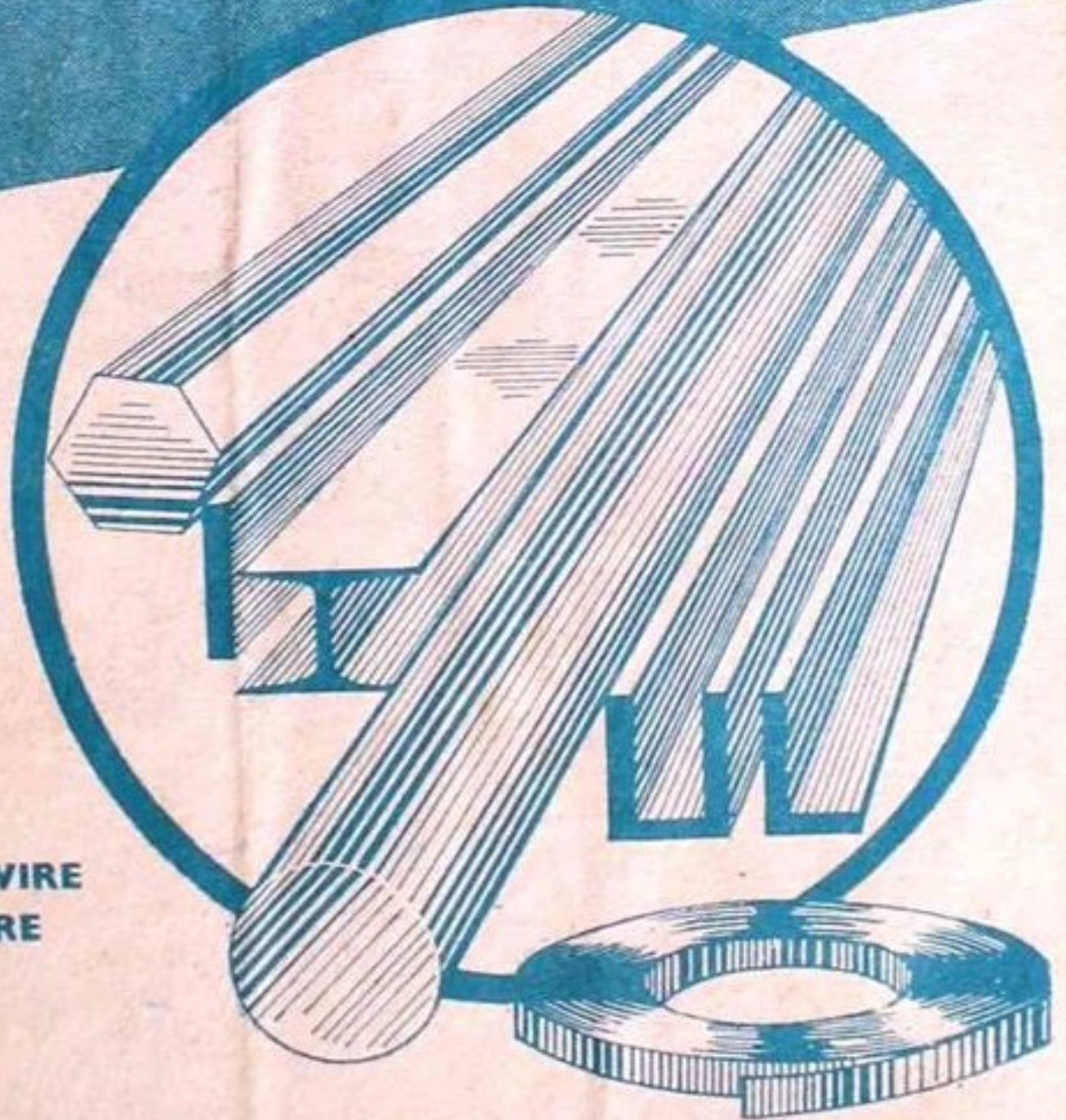
Products manufactured:

BARS

(Round and Deformed)

ANGLES**TEES****JOISTS****CHANNELS****SQUARES****FLATS****BALING HOOPS**

(Hot & Cold Rolled)

GALVANIZED WIRE**HARD DRAWN NAIL WIRE****BLACK ANNEALED WIRE****BARBED WIRE.**

For your requirements contact

STEEL SALES LIMITED

Sole Selling agents.

STEEL CORPORATION OF PAKISTAN LTD.

Jubilee Insurance House, McLeod Road, Karachi. Phone: 31641-8. Cable Address "STEELSALES" Karachi

Czernin Palace, Bank Square, The Mall, Lahore.

Deliveries can be effected either Ex-Mill Landhi or West Wharf Godowns

مارچ ۱۹۶۲ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

عارف نیازی

فرمان فتحپوری

قیمت فی پرچہ
پچھتر پیسے

زرد سالانہ
دس روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی - بموجب سرکلر نمبر ڈی ۱۰۰ - پی - بی ۳۶۶۹ - ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی
پرنٹر پبلشر - عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا - کتابت - عالم علم

ماہنامہ پاکستان

ماہنامہ طوطی کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا

فہرست

۴۳واں سال | فہرست مضامین مارچ ۱۹۶۴ء | شمارہ (۳)

۳	 نیاز فتحپوری	 ملاحظیات - کانگریس اور گاندھی جی
۷	 نیاز فتحپوری	 تاریخ اسلام میں کینزدوں کا اثر و اقتدار
۱۲	 نظیر صدیقی	 پاکستان کا موجودہ اخلاقی موقف
۲۱	 رشید احمد صدیقی	 ادھر ادھر کی
۲۸	 محمد مظہر بقا ایم۔ اے	 عباسی دور میں شاعری کے رجحانات
۳۳	 حنیف نقوی	 منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی
۴۲	 زیب النساء بیگم	 قربانی - شرعی و عقلی نقطہ نظر سے
۴۷	 محمد سلیمان اختر	 شہادت عظمیٰ
۵۴	 کرامت علی کرامت	 باب الانتقاد - اردو کا ایک جدید شاعر مٹھو و سعیدی
۶۰	 نیاز فتحپوری	 باب المراسلہ - غلام جیلانی برقی اور میں
		 باب الاستفسار - ۱۔ عالم برزخ
۶۳	 نیاز فتحپوری	 ۲۔ فردوسی اور عربی الفاظ
		 ۳۔ پل صراط
		 ۴۔ زلف شبگیر
۷۲		 منظومات - فضا بن فیضی - ادیس احمد دوراں
		 سعادت نظیر - شارق میرٹھی
		 تالیش شجاع آبادی
۷۷	 ادارہ	 مطبوعات موصولہ

کراچی

ملاحظات

کانگریس اور گاندھی جی میری نگاہ میں اب سے ۲۵ سال قبل جب میں ہندوستان میں تھا

ایک جماعت کی تنظیم کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں ایک اس کا نظریہ، دوسرے اس کا عمل، یعنی پہلے ہم یہ متعین کر لیتے ہیں کہ ہمارا مقصود کیا ہے اور پھر اس کے بعد اس کے حصول کے لئے تگ و دو شروع کرتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اصول و عمل دو چیزیں ہیں جن پر حصول مدعا کا انحصار سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصول بالکل بیکار چیز ہے اگر ان پر عمل نہ کیا جائے اور اسی لئے دنیا میں جب کوئی انقلاب رونما ہوا تو وہ اصول کا نہیں بلکہ شخصیتوں کا مرحون منت تھا اور جب وہ شخصیتیں نہ رہیں تو اصول بھی بیکار ہو گئے۔

اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہم کو تاریخ مذاہب میں ملتی ہیں۔ اسلام کے اصول آج بھی وہی ہیں جو تقریباً چودہ سو سال پہلے پائے جاتے تھے لیکن چونکہ شخصیتیں وہ نہیں ہیں اس لئے وہ اصول بالکل بے روح ہو کر رہ گئے ہیں۔ الغرض ہر اجتماعی ادارہ میں ہمیشہ انھیں دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اب آئیے اس کلیہ کو پیش نظر رکھ کر ہم کانگریس کا بھی تجزیہ کریں۔ کانگریس نے ہمیشہ اس کا اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے مکمل آزادی چاہتی ہے اور یہ ایسا اعلان ہے کہ اخلاقی و اصولی حیثیت سے دشمن کو بھی اس کی مخالفت نہیں ہو سکتی، لیکن اس وقت تک جتنی شخصیتیں اس مقصود کے لئے اٹھیں، ان میں سوا دو چار کے سب وہی تھیں، جن کی حلق سے تو یقیناً آزادی کی آواز نکلتی تھی، لیکن دل میں ان کے کچھ اور تھا جسے وہ ظاہر نہ کرتی تھیں۔ وہ کچھ اور کیا تھا؟ — اس کو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مکمل آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔

سیاسیات کا سر طالب علم واقف ہے کہ اب دور ملکیت آخری سانس لے رہا ہے اور اس کی جگہ ڈما کر لسی نے لے لی ہے لیکن ڈما کر لسی سے میری مراد وہ ڈما کر لسی نہیں جس کے سامنے ارشاد کر لسی کی عیش پرستیاں اور عیاشیاں بھی شرم جاتی ہیں۔ بلکہ وہ حقیقی ڈما کر لسی جو ملک کے تمام افراد کو انسانیت کی ایک ہی سطح پر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا نام آپ چاہے جمہوریت رکھیے یا اشتراکیت۔ فوضویت رکھے یا عدویت۔

نوع انسان کی غلامی کا ذمہ دار صرف یہ جذبہ ہے کہ ایک جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعت سے بلند سمجھے اور اس جذبہ کی پرورش سب سے زیادہ دو چیزوں نے کی۔ ایک مذہب اور دوسری دولت، اس لئے اگر دنیا میں کوئی حکومت ایسی ہے جس میں مذہب و سرمایہ داری دونوں کی رعایت کی جاتی ہے تو چاہے وہ الٰہی حکومت ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہے غلامی کی حکومت اور ہم کبھی اس کو آزاد حکومت نہیں کہہ سکتے۔ پھر جس وقت کانگریس کی طرف سے پورنا سوراج کا اعلان ہوا تو میں نے غور کیا کہ کیا واقعی وہ مذہب

دولت کی دنیا سے علیحدہ صرف "انسانیت" کے اصول پر عمل کرے گی اور کیا ممکن ہے کہ "یہ خاکدانِ ہند" کسی وقت حکومت کے اس فرد کی تحویل کو بروئے کار لاسکے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کس نتیجہ پر پہنچتا، خود کانگریس ہی کے طرزِ عمل نے بتا دیا کہ اتنی بلند چیز سے اس کو نسبت دینا درست نہیں اور وہ قوم جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کرتی چلی آرہی ہے اس کی بلند ترین آزادی کا تصور بھی غلامی کی بو سے پاک نہیں ہو سکتا۔

میں اس وقت کانگریس کی ابتدائی یاد دہانی تاریخی سے بحث کرنا نہیں چاہتا اور یہ ذکر مناسب ہے کیونکہ یہ زمانہ محض بددجہ کا تھا۔ بلکہ اس دور کو لیتا ہوں جب کوشش کے بعد نتائج پیدا ہونے لگتے ہیں اور آپ بھی میرے ساتھ غور کیجئے کہ کیا کانگریس واقعی "مکمل آزادی" کی طلبگار ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں صرف ایک ہی شخصیت ہے جو کانگریس کے عروج میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے اور جسے عرصہ سے ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل ہے پہلے کانگریس چاہے جو کچھ رہی ہو، لیکن اب وہ بالکل اسی کی آواز ہے اسی کی نگاہ ہے اور اسی کی مرضی پر اس کی کارگاہ قائم ہے۔ اسی لئے اگر ہم کو گاندھی جی کی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے تو کانگریس کا اصول کار آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

"پورنا سورا ج" غالباً گاندھی جی کا وضع کیا ہوا لفظ ہے اور اس کی جو تفسیر اکھنوں نے بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ "آزادی کامل" ہی ہو سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لفظ پورنا کی جو عملی صورت گاندھی جی کے ذہن میں ہے، وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمہ "کامل" کر ہی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے جسے ہم صرف عصبيت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں "ہندو راج"۔

میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ ایک ملک کی کامل آزادی ایک کامل ڈما کر سی چاہتی ہے اور صحیح ڈما کر سی میں "مذہب و دولت" دونوں کا گزر نہیں لیکن گاندھی جی بذات خود نہایت شدید قسم کے بت پرست انسان ہیں اور مذہب کا کوئی ایسا بلند نظریہ ان کے سامنے نہیں ہے جو ملتوں کے اختلاف کو نظر انداز کر دے۔ اسی کے ساتھ وہ سرمایہ دار طبقہ کے بھی حامی ہیں۔ ہر چند ان کی زندگی شیوں کی سی زندگی ہے جس میں دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی اختیار کرنی جاتی ہے، لیکن بسا اوقات دنیا سے احتراز کرنا ہی، شدید دنیاوی تعلق بن جاتا ہے اور اس طرح جو اقتدار انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اس پر قیصر و کسریٰ کی حکومتیں بھی قربان ہیں۔ دولت کا مقصد کبھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنا فرمانبردار بنایا جاسکے اس لئے جب دولت سے احتراز اس مقصد کو پورا کرنے والا ثابت ہوتا ہے تو پھر فریب نفس کے لئے کسی اور دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں خالص ذاتی اغراض متعلق نہیں ہوتیں لیکن ان کی جگہ اجتماعی اغراض لے لیتی ہیں اور عصبيت کی وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس میں فرد کا مقابلہ فرد سے نہیں بلکہ ایک جماعت کا دوسری جماعت سے ہوتا ہے۔ الغرض گاندھی جی کا ضمیر کیسا ہی پاک و صاف ہو لیکن جو راہ اکھنوں نے کانگریس کے لئے متعین کی ہے اس میں ضرور ایسی آلودگیاں نظر آتی ہیں جو صحیح ڈما کر سی کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔

گاندھی جی کے ڈپلومیٹ ہونے میں شک نہیں، لیکن ان کی ڈپلومیسی میں وہ بلندی نہیں پائی جاتی جو خالص انسانیت پرست انسان کی راہِ عمل میں پائی جانا چاہئے۔ ان کے عزائم میں ایک شیر کا سادولہ نہیں ہے بلکہ گھات میں لگے رہنے کا سا انداز ہے تاکہ کم سے کم خطرہ میں پرکھ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ ان کی ستیاگرہ، ان کا جہر خا اور ان کا کھدر

الغرض اُن کی ہر اسکیم میں، مطالبہ کا وہی انداز ہے جو ایک دھڑنا دے کر سیٹھ جانے والے سایل کا ہوا کرتا ہے۔ ہر چند مقابلہ کی یہ صورت بہت سخت ہوا کرتی ہے اور دشمن ایک اخلاقی دباؤ محسوس کر کے پریشان ہو جاتا ہے، لیکن اس کامیابی کا ردِ عمل ہمیشہ تنگ نظری ہوا کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی ڈکٹیٹر شپ نے کانگریس کی طرف سے ملک کے بعض طبقوں کو ٹھن کر دیا ہے اور کانگریسی حکومت میں انھیں وہ صاف باطنی نظر نہیں آتی جو مختلف انجیال جماعتوں میں اعتماد پیدا کر کے مرکزیت پیدا کر دیتی ہے یہ درست ہے کہ ملک کی اصلاح کے لئے گاندھی جی نے بہت کوشش کی لیکن یہ اصلاح بھی صرف اسی طبقہ تک محدود رہی جس نے وہ وابستہ ہیں، انھوں نے ہریجن تحریک سے ہندو جماعت کی اکثریت کو قوی کر کے کوئی فائدہ پہنچا یا ہو تو پہنچا یا ہو لیکن اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اگر بجائے گاندھی جی کے کوئی ایسا شخص لیڈر ہوتا جو مذہب و سرمایہ داری سے متاثر نہ ہوتا، تو سب سے پہلے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق کو دور کرتا جو ہریجن تحریک سے زیادہ ضروری تھا۔ لیکن چونکہ گاندھی جی سخت قسم کے ہندو ہونے کی بنا پر خود بھی مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے کو اچھا نہیں سمجھتے اور سرمایہ دار ہندوؤں سے بگاڑنا بھی مناسب نہیں جانتے اس لئے انھوں نے ذات پات مٹانے کی تحریک اسی جماعت میں شروع کی جو ہر نوع ہندو تھی یا ہندویت سے قریب تر اور مسلمانوں کو بدستور ملک سے رہنے دیا۔ الغرض گاندھی جی نے پورا ناسوراج کا تو اعلان کر دیا لیکن اس کے حصول کے لئے جو راہ عمل انھوں نے متعین کی وہ مستعمراتی آزادی کی منزل سے آگے نہیں جاتی، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندو جماعت جس کا ذہن آزادی کامل کے تصور سے بالکل خالی ہے۔ اس سے زیادہ کی تمنا کر بھی نہیں سکتی۔

اب دیکھئے کہ قبول وزارت کے بعد کیا ہوا اور کانگریسی حکومت سے پہلے کو کیا فائدہ پہنچا۔ دنیا کی اور چیزوں کی طرح حکومت کے بھی دو پہلو ہوا کرتے ہیں، داخلی و خارجی۔ خارجی پہلو کے متعلق تو خیر کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ کیونکہ صفائی و پاکیزگی کا جو مفہوم ہندو قوم نے متعین کیا ہے وہ بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر ہم کو کانگریسی حکومت کے دفاتر میں ظاہری بدترتیبی، گندگی اور پھوٹن نظر آتا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا داخلی پہلو بھی قابلِ تعریف نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہندوؤں کا واقعی منشاء کیا ہے اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کونسی ذہنیت نشوونما پا رہی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی حکومت ہے، ہندوؤں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو انھوں نے ستایا تو حکومت ان کی مدد کرے گی۔ یقیناً کانگریس حکومت نے کبھی سرکاری طور پر اس کا اعلان نہیں کیا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا ساتھ دے گی لیکن اس کے عمل سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس باب میں سب سے بڑا الزام جو کانگریس حکومتوں پر قائم کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی پیدا کی ہوئی ذہنیت مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے بجائے اور زیادہ افتراق کی صورتیں پیدا کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے اور ہندوؤں نے اگر ان کی خصوصیات قومی کو ملحوظ نہ رکھا تو اتحاد ناممکن ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے لیکن بد قسمتی سے اسکو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک مشترک زبان "ہندوستانی" کے نام سے رائج کرنا چاہتی ہے جو اردو و ہندی رسم الخط دونوں میں لکھی جائے گی۔ لیکن کانگریس حکومتوں کو جو مطلب اس کا بتایا جاتا ہے وہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبہ کی حکومت کا طرز عمل ملاحظہ ہو کہ جب کسی مضمون یا قانون کا ترجمہ انگریزی سے ہندوستانی میں کیا جاتا ہے تو اردو میں علیحدہ اور

ہندی میں علیحدہ، یعنی ان دونوں ترجموں میں صرف رسم الخط کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کا بھی ہوتا ہے اور ایسا نمایاں اختلاف کہ دونوں ترجمے دو مختلف زبانوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا مشترک زبان پیدا کرنے کی یہی صورت ہوا کرتی ہے۔ ہندوستانی مشترک زبان کی خصوصیت صرف یہ ہونی چاہئے کہ ہر شخص اس کے الفاظ کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکے خواہ وہ الفاظ عربی فارسی کے ہوں یا انگریزی و سنسکرت کے۔ لیکن ہمارے صوبہ کی کانگریسی حکومت نے ہندوستانی "زبان" کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ وہ لفظ جو فارسی یا عربی الاصل ہے خارج کر دینے کے قابل ہے خواہ وہ کتنا ہی عام فہم کیوں نہ ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے تجویز کئے ہوئے ترجمے مقبول ہوئے یا نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا ذہنیت تھی جس نے انھیں اس گل افشانی پر مجبور کیا۔

یہ حال ہے ارکان وزارت اور اکابر کانگریس کے تعصب کا جو کونسل چمبر کے ہال میں دن دہاڑے برتا جا رہا ہے اور اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ دفاتر میں جو پہلے ہی سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دو اینیوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ کانگریس کی وزارت سے پہلے جب کسی مسئلہ میں مجسٹریٹ ضلع کی رپورٹ استناداً پیش کی جاتی تھی تو کہا جاتا تھا کہ اس رپورٹ کا کیا اعتبار، لیکن آج جب بد امنی یا ہندو مظالم چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسی مجسٹریٹ کی رپورٹ کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اور معترض کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کا یقین کرے۔

میں نے بہت غور کیا کہ ایسا کیوں ہے تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانوں سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گائیری کی جاب کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا — ہندو مہاسمبھا اور اس جماعت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ علی الاعلان مسلمانوں کی مخالف ہے اور یہ گھات سے کام لے رہی ہے۔

کانگریس بظاہر دفاق کی مخالف ہے، لیکن جب وقت آئے گا تو وہ ضرور اس میں شریک ہو جائے گی۔ گاندھی جی اور لارڈن لنتھگو کی ملاقات کا بھی یہی مقصود تھا اور اب مسٹر جینا سے جو گفتگو ہو رہی ہے وہ بھی اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو بعض مخصوص رعایتوں کا سبز باغ دکھا کر دفاق کے لئے راضی کر لیا جائے، لیکن اس سے مسلمانوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوؤں کا زور یہ نظر حکومت کے باب میں بدل گیا ہے۔ وہ اگر مستعمراتی آزادی پر راضی ہیں تو اس لئے کہ برطانیہ عظمیٰ کی "کامن ویلتھ" سے متعلق ہوئے بغیر وہ یہاں اپنے ہندو راج کے خواب کو پورا ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور وہ اس وقت کچھ کھونے کے بعد بھی یہ سودا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

اقبال نمبر

جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوار شاعری اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاقی و تصوف اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :- تین روپے
مہینچر - نگار پاکستان - گارڈن مارکٹ - کراچی

تاریخ اسلام میں کینزوں کا اثر و اقتدار

نیاز فتحپوری

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے اور اس کی ابتداء کا سراغ اس وقت سے چلتا ہے جب دو افراد انسانی میں سے ایک نے اپنے آپ کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ بھی ہے کہ وہ مغلوب و کمزور پر حکومت کرے، اس کو ستلے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اپنی قوت کا اعتراف کراتا ہے۔

اس لئے دنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جب اول اول انسان میں قبائلی زندگی کا آغاز ہوا اور سرداران قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی، اس لئے دنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیران جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے بلکہ قتل کر ڈالتے تھے البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کچھ رواج اس قدر وسیع ہوا کہ زمانہ امن و صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں یہ رسم قائم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہل اشوریہ، ہندوؤں چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قائم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی اہل عرب عہد جاہلیت میں اسیران جنگ کو بھی غلام بناتے تھے۔ اور ان کو بھی جفیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے۔ چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش و عینہ کی طرف سے لونڈی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت وہ اسی طرح کرتے تھے جیسی دوسری چیزوں کی، چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جیدان عہد جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد ۱)

وہاں غلام بطور بردہ کے بھی دیئے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح سی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱۲)

قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابوہامب اور عاصی ابن ہشام نے آپس میں جو اھیلا اور شرطیہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابوہامب جیتا اور اس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر ادنیٰ چرانے کی خدمت اس سے لی (الافغانی ص ۱۰۰ ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے مگر ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے دفعۃً نہیں مٹایا جاسکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام فوراً اس کو نہ بند کر سکتا تھا لیکن اس نے بعض اصول و قوانین ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مہم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا ردیما ہونا لازم تھا۔ چنانچہ بردہ فروشی کے دائرے کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیران جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی

کی دست کو کم کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا، اور وہی چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو کنیزیں تقسیم ہوئیں۔ اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار خلیفہ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے اور واقعہ اُرک کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر و غیر کے بعض ذمی جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:-

من كانت لها جارية فعلمها واحسن اليها وتزوجها
كان لها اجران اجر بالزواج والتعليم واجر
بالعتق۔

یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اور شادی کر لے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں) چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی اور عربوں کے حالات و اقدار طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیلہ کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں کتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کس قدر کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا۔

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ البتہ سلطنت اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیادت کی اور بہت سی ناچار خواہشات کی طرح بدستور قائم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی اس کی ذہنی و معاشی ترقی کسی حد تک پہنچ گئی۔

گذشتہ بیان سے معلوم ہوا ہو گا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہتی تھی۔ جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت، عمر و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قائم ہوا۔ گویا کہ وہ بھی زہر و جہر کی طرح ایک چیز بدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ کس امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناعت کنیز پیش کی جاتی تھی اور اگر جمال و عنایہ کی طرف کوئی خلیفہ مائل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہو گیا اور غمہ بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے۔

کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء نکاح کر لیتے تھے تو انھیں آزاد کر دیتے تھے اور پھر ان کا مرتبہ بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ متوکل کے پاس ۴۰۰ کنیزیں تھیں (المسعودی ص ۲۷۹ ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ اباب

نشاط میں شامل تھیں۔ اور گانے بجانے کی ماہر تھیں۔ (الافغانی ص ۸۸ ج ۲) محض زینت و آرائش اور نمائش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور ام جعفر برکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف اس لئے تھیں کہ ان سے شان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی۔ لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلاد ترک و صقلیہ، ہند، آرمینیا، روم، اور افریقیہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لئے یہاں بڑے بڑے بازار قائم تھے جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی۔ بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا اور اس کا نام "سوق الرقیق" یا "سوق النجاشی" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر و رنگ زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں۔ یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلیہ، ایران، ارمینیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت ہی شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں۔ اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کر دی جاتی تھیں۔ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے اور زینت و آرائش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبیعی حسن جو صنعت آرائش سے علیحدہ ہو۔ شخص کو معلوم ہو سکے۔ بڑے بڑے تاجران کی شکل صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کر کے مختلف دموں میں خرید لیتے تھے۔ چنانچہ عہد اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست دان عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو ان کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نو گرفتار برنی کے اضطراب کا لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد، مکلف لباس سے آراستہ، اور فن دلربائی کی گھاتوں سے واقف ہو کر ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمہ شیریں، نگاہوں میں دلربا یا نہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لہجہ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقہ امرا میں تہلکہ مچ جاتا اور وہی کنیزیں جو چند درہموں میں خریدی گئی تھیں لاکھوں میں فروخت ہوتی تھیں۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اہل عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے وہ ان کے قولے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کو مہذب و شائستہ بنانے والا تھا۔ اس سلسلے میں جس قدر وحشی و نا تراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں اور خود ان کے لطف سے جیسے جیسے خلفاء و عظام اور علماء کرام پیدا ہوئے ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالا مال ہیں۔

۱۔ ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے۔ صاحب آغانی نے کہا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے جن کی ابتدا ان فقرہوں سے ہوتی ہے "من کان لنا، لنا لہ"، (یعنی جو ہمارا ہے ہم اس کے ہیں) و "صنع الخلد للهوی عین"، (فرط محبت سے کال پر کال رکھ دینا کس قدر پیاری بات ہے)

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے فروخت کی جاتی تھیں یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہو جاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہو جاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے :-

یا متجار، یا ارباب الاموال، ما کل مد ورجوزة و
کل مستطيلة موزة ولا کل حمرا لحمية ولا کل بصیاء
شحمية ولا کل صهباء خمرية ولا کل سمراء عمتة یا متجار
هذه الدرقة الیتمة التي لا تقی الاموال لها بقیمتہ بکمر
تفتحون باب الثمن

اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز خریدت ہوتی ہے، نہ ہر مستطیل چیز کیلا۔
ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی۔ اس طرح نہ ہر صہبائے شراب
ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زرِ خطیر بھی اس کی قیمت
نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار، کسی طرف سے
چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں آٹھ ہزار کی الغرض اخیر میں سب زیادہ قیمت لگانے والا وہ دُر بے بہا پا جاتا اور اپنے گھر کو
چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہل رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آکر انھیں دیکھتے اور
ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے، جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے
ہیں اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہل عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جہاں
وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو نارس کی لونڈیاں لی جائیں۔ اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں۔ تنہا
طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حسن
ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترک کی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، مکرمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے سناد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام
طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف سرعہ نافذ ہو گیا تو لوگوں
نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانے میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت
کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ التجارة فی الرقیق محقة (یعنی بردہ فروشی قوم کو تباہ کرنے والی ہے)
کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکرِ اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت
ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو بکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہل لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہل رومہ

کا دستور تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی کسی کنیز کو اس کا ذہن قیادہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے ادب و سخن کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے اور پھر بازار میں لاکر سوکے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا۔ بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طائف وغیرہ کی کنیزیں) کہ ان کی گرانی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار ادا کی (ابن خلکان ص ۱۰۶ ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبد الملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفار کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی۔ (الطبری ص ۳۳ ج ۲) جعفر بن یحییٰ نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خرید کی (العقد الفرید ص ۳۰ ج ۳) ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا جہاں سے خلیفہ گذر کرتا تھا۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بے جا صرف کیا تھا۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید لیا جائے۔ جعفر نے انکار کیا تو امین نے برہم ہو کر دوسرا حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی اور دو کروڑ درہم ادا کئے گئے۔ عہد سنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا تھا اور اتنا زبردست اثر ان کا خلفاء پر قائم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی۔

چنانچہ یزید بن عبد الملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے رشید کی ماں خیزدان خود کنیز تھی۔ اسی طرح خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ التریکیہ لونڈی تھی لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔

الغرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خلفاء ان کے غلام تھے۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ ۱۔

علی شیر خاں

محلہ کھترانہ کلاں۔ رائے بریلی۔ یو۔ پی۔

پاکستان کا موجودہ اخلاقی موقف

(پروفیسر) لطیف سرفقی

انسانی تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ بیک وقت انسانی تاریخ کا بہترین دور بھی ہے اور بدترین دور بھی۔ اس دور کی بیشتر برکتیں مغربی قوموں کے حصے میں آئی ہیں اور بیشتر لعنتیں مشرقی قوموں کے حصے میں۔ مشرق کی جو قومیں سیاسی اقتصادی اور تہذیبی نقطہ نظر سے حد درجہ خستہ حال ہیں اس میں پاکستانی قوم بھی شمار کی جاسکتی ہے بشرطیکہ قومی وقار کا جھوٹا احساس مانع نہ آئے۔ پاکستان کو دنیا کی بعض غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ قوموں سے بہتر کہا جاسکتا ہے اور ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن یہ موازنہ کچھ ایسا ہوگا جیسا کہ داغ کے اس شعر میں ہے۔

حقیقت میں ہو تم دنیا سے اچھے

حقیقت میں مگر دنیا ہی کیا ہے

بدترین کے مقابلے میں اپنے آپ کو اچھا یا بہتر کہہ لینا خود اطمینانی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے لیکن حقیقت پسندی کے مطالبات کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتا۔ قومی اعتبار سے ہم پاکستانیوں کی سب سے بڑی کمزوری غالباً یہ ہے کہ ہم حقیقت پسند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے جب کوئی شخص ملک کی بد حالی اور قوم کی سست رفتاری کا ردنا کرتا ہے تو اس بد حالی اور سست رفتاری کو قومی بدحالی اور کمزوری کا نتیجہ تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے دیتے ہیں کہ ابھی پاکستان کی پیدائش کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کہ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا اب خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے۔ شروع میں ہمارے پاس دفتروں کے لئے میزیں اور کرسیاں تک نہیں تھیں اب ہر شعبہ کا شاندار دفتر موجود ہے۔ جہاں پہلے کپڑے کی چارمیں تھیں وہاں اب بیس ملیں ہیں دلی ہذا القیاس۔ لیکن ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہماری طرح دنیا کی بعض اور قوموں نے بھی آج گیس پندرہ سال پہلے از سر نو زندگی شروع کی تھی ان کے پاس بھی آج سے دس پندرہ سال پہلے کچھ نہیں تھا یا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ کہاں ہیں ادھم کہاں۔ مثلاً جرمنی، جاپان، روس اور چین کو لے لیجئے۔ فیلڈ مارشل مونٹ گو میری اپنی کتاب *An approach to sanity* میں لکھتے ہیں: "ما سکواب اس شہر سے بہت مختلف ہے جب میں وہاں جنوری ۱۹۴۷ء میں گیا تھا۔ ان دنوں پوری روسی قوم ہٹلری جنگ کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے نکل رہی تھی۔ ۱۹۴۱ء کے جرمن حملے اور جنگ سے پیدا ہونے والی تباہی نمایاں تھی۔ لوگ نہایت معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ خوراک کی بڑی قلت تھی۔ مکانوں کی صورت حال حد درجہ بری تھی اور یہ مسئلہ تقریباً لائیکل معلوم ہوتا تھا۔ لندن واپس آکر میں نے برطانوی حکومت کو اطلاع دی کہ روس پندرہ بیس سال سے پہلے کوئی ایسی بڑی جنگ نہیں چھیڑ سکتا جس میں اس کی کامیابی کا کوئی امکان ہو۔ وہ زمانہ اسٹالن کی حکومت کا تھا۔ لوگ دل شکستہ اور خوف زدہ نظر آتے تھے لیکن اب (متذکرہ کتاب ۱۹۵۹ء میں چھپی) حالات بدل چکے ہیں، اسٹالن

کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ اشیائے خوردنی کثرت سے دستیاب ہیں۔ بچے خوش نظر آتے ہیں۔ مکانوں کے مکے کو بڑی مستعدی کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں فلیٹس کے بڑے بڑے بلوئس ابھر آئے ہیں۔ لوگ پہلے کی بہ نسبت بہت اچھے کپڑے پہننے لگے ہیں۔

تو یہ اس ردس کا حال ہے جو دوسری جنگ عظیم میں بالکل تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ دس بارہ سال کے اندر اقتصادی طور پر بحال ہو گیا بلکہ گزشتہ سترہ اٹھارہ سال کے اندر وہ دنیا کی دو عظیم ترین سیاسی اور فوجی قوتوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ جرمنی جس کے حصے میں نہ صرف تباہی آئی تھی بلکہ شکست بھی اسی پندرہ سولہ سال کے اندر دنیا کا نہایت خوش حال ملک بن گیا ہے۔ میں ڈھاکے کے جرمن کچرل انسٹیوٹ کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جرمن امریکہ سے بھی زیادہ دولت مند ہے۔

چین جس کی سیاسی عمر پاکستان سے بھی کم ہے اور جس کی آبادی پاکستان سے سات گنی زیادہ ہے وہ اسی چودہ پندرہ سال کے اندر دنیا کی تیسری بڑی قوت بننے کی دھمکی دے رہا ہے۔ جاپان بھی دوسری جنگ عظیم کے بلے سے نکل کر دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ یعنی جس طرح یہ تینوں ملک اپنے بنیادی مسائل کو کم سے کم عرصے میں حل کر کے جس قدر آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا عشر عشر بھی پاکستان کو حاصل نہیں۔ آخر اس کی وجہ ؟

ہماری محرومیوں کا بنیادی سبب یہ نہیں کہ ہمیں ہندوستان کے مقابلے میں امریکی امداد کم مل رہی ہے۔ غالباً ہماری ساری لپٹی کا راز یہ ہے کہ ہمارے اندر اجتماعی ترقی کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ ہر شخص ذاتی ترقی، ذاتی خوش حالی اور ذاتی کامیابی کے لئے کوشاں ہے لوگ انفرادی طور پر ترقی اور کامیابی کی لمبی لمبی جست ضرور لگا رہے ہیں لیکن ملک میں اجتماعی ترقی اور اجتماعی خوش حالی نایاب ہے واقعہ یہ ہے کہ پاکستان جس قدر ابتری کے دور سے گزر رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خواب دیکھنے والے اسی ملک میں خلافت راشدہ تک کے دور کو واپس لانے کا خواب دیکھ رہے ہیں لیکن جو لوگ خواب دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں انھیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ کسی ملک میں نہیں جنگل میں رہ رہے ہیں کیونکہ یہاں کسی متمدن ملک سے زیادہ جنگل کے قوانین کا فرما ہیں۔ وہ کونسی برائی ہے جس کی روک تھام کے لئے پاکستان میں قانون موجود نہیں۔ لیکن وہ کونسی برائی ہے جو اس قانون کے باوجود کثرت کے ساتھ قومی پیمانے پر کہیں چھپ کر اور کہیں کھل کر عمل میں نہیں آرہی ہے۔ یہ بات سننے میں تو اچھی معلوم نہیں ہوتی لیکن کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ ہم پاکستانی ایک غیر صالح قوم ہیں۔ قانون شکنی کی عادت ہم میں اس درجہ راسخ ہو چکی ہے کہ جب تک قانون ہمیں نہ توڑ دے ہم قانون کو توڑنے سے باز نہیں آسکتے۔ ہم تہذیب و شائستگی کی اس سطح سے بہت دور ہیں جہاں آدمی کو انسان بنانے کے لئے تعلیم و تبلیغ کافی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کسی جرم سے توبہ کریں تو اس لئے نہیں کہ توبہ کرنے سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ اس لئے کہ توبہ نہ کرنے سے ہمیں شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی سماج جن برائیوں میں مبتلا ہے ان کی سزائیں سخت سے سخت ترکی جائیں اور جرم و سزا کے درمیان وقت کے فاصلے کو کم سے کم کیا جائے۔

صحیح معنی میں مہذب قوم تو وہی ہے جو قوانین کی پابندی پولس کے خوف سے نہیں بلکہ سماجی شعور کے تقاضے سے کرتی ہے لیکن ابھی ہم اس سماجی شعور سے بہت دور ہیں۔ اجتماعی ذمہ داری کا احساس دوہی طریقے سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے سے اور تعزیر کے ذریعے سے۔ ہمارے یہاں کہنے کو تعلیم و تعزیر دونوں موجود ہیں لیکن روزمرہ زندگی میں اثر نہ اس کا ہے نہ اس کا۔ سبب یہ ہے کہ تعلیم ناقص ہے اور تعزیر ناکافی۔

اسکولوں میں ہاجن اور کالجوں میں سیوکس پڑھنے کے باوجود طلبہ میں نہ ہائیکس سنس نظر آتا ہے نہ سیوک سنس۔ رات کے وقت بغیر لائٹ کے سائیکل چلانے والوں یا قانونی ہدایت کے برعکس غیر معمولی رفتار سے اسکوٹر، کار، ٹیکسی اور بس چلانے والوں کو سزا ملتی ہے لیکن ایسی کہ ان کی عادت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہونے پاتا۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری عادت کی غلامی ہے۔ جب وہ کسی چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اپنی عادت کے نقصانات کو ترک عادت کے فوائد پر ترجیح دینے لگتا ہے ہم پاکستانیوں کو جرائم کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہم پر وعظ و نصیحت اور تعلیم و ترغیب کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ نفسیاتی طریقے سے برائیوں کے علاج کا قابل تو میں ضرور ہوں لیکن جب پوری قوم مریض یا مریضہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ تو اتنے وسیع پیمانے پر نفسیاتی طریق علاج کا استعمال انسانی طور پر ممکن ہی نہیں۔

ان حالات میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم مجرمانہ عادتوں کو ترک کر سکتے ہیں تو صرف آئینی سختی کے ڈر اور سزا کے اثر سے، شروع شروع میں تو ہم قانون کی پابندی خوف سے کریں گے بعد میں یہ پابندی عادت بن جائے گی اور اس عادت کے فوائد ہم پر روشن ہوتے جائیں گے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے کئی سال پہلے ڈھاکہ کے بس جب یہ حکم نافذ کیا گیا کہ بسوں پر سوار ہونے والے قطار بنا کے کھڑے ہوں تو لوگ اس حکم کی پابندی پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن جب پولس نے اپنے ڈنڈے سے کام لینا شروع کیا تو لوگوں کو قطار میں کھڑا ہونا آ گیا۔ اب بس اسٹینڈ پر پولس کے نہ ہونے کے باوجود لوگ قطار میں اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب مارشل لا نافذ ہوا تو ایک حکم یہ صادر کیا گیا کہ جس شخص کے گھر کے سامنے گندگی دیکھی جائے گی اس سے وہ گندگی صاف کرائی جائے گی۔ اس حکم کا اثر یہ نظر آیا کہ مارشل لا کے ابتدائی دور میں ہر محلہ صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ بعد میں چونکہ مارشل لا خود دھویلا پڑ گیا اس لئے پرانی عادتیں واپس آ گئیں۔ لوگ بسوں میں مقررہ تعداد سے زیادہ سوار ہونے لگے۔ بسوں میں بیڑی سگریٹ پینے لگے۔ بسوں کی رفتار قانون کی ہدایت کی بجائے ڈرائیور کے موڈ کی پابند ہو گئی۔ رات کے وقت سائیکلیں بغیر لائٹ کے چلائی جانے لگیں۔ بازاروں میں کھانے پینے کی چیزیں بھینٹنا دیکھیوں کے سامنے بکے لگیں۔ دفتر جانے آنے میں اوقات کی پابندی ختم ہو گئی۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہونے لگا جو ہوتا آیا تھا، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ جب مارشل لا بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو پھر اور کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

پولس اور مارشل لا کے ذکر سے یہ نہ سمجھئے کہ میں پولس راج اور مارشل لا کا حامی ہوں۔ میرا مقصد صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ ہم برائیوں میں اس حد تک ڈوبے ہوئے ہیں کہ بغیر کسی خوف و خطر کے اچھی عادتیں اختیار کر ہی نہیں سکتے آپ نے دیکھا ہو گا کہ پولس داڑے اچانک کبھی کبھی رات کے وقت لائٹ کے بغیر سائیکل چلانے والوں پر حملہ کر دیتے ہیں چونکہ یہ حملہ سال بھر میں مشکل سے دو تین مرتبہ ہوتا ہے اس لئے سائیکل چلانے والوں پر اس حملے کا کوئی اثر نہیں ہوتا، (خود میں ایک مرتبہ اس حملے کی زد میں آچکا ہوں اور مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے) میرا خیال ہے کہ جب تک ہر شہر میں اور ہر شہر کی ہر شاہراہ پر کم از کم چھ مہینے تک مسلسل سائیکل چلانے والوں کے خلاف پولس کی یہ مہم جاری نہ رہے گی انھیں لائٹ کے ساتھ سائیکل چلانے کی عادت نہ پڑے گی۔

جہاں ہماری عادتوں کو ترک کرانے کے لئے باقاعدگی کے ساتھ مردوجہ قانون پر عمل درآمد کی ضرورت ہے وہاں بعض عادتوں کا خاتمہ کرنے کے لئے قانون کو سخت تر بنانے کی بھی ضرورت ہے۔

دور حاضر میں سزائے موت کے خلاف اکثر ملکوں میں تحریکیں چل رہی ہیں۔ سزائے موت کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں

ان میں سے بعض یقیناً بہت دزدی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات قانون کی موٹگیابی مجرم کی بجائے کسی معصوم کو سزائے موت دلوادیتی ہے۔ لیکن اس اتفاقی اور امکائی نا انصافی کے باوجود میں بعض دجورہ کے پیش نظر سزائے موت کو باقی رکھنے کا حامی ہوں بلکہ میرا یہاں تک خیال ہے کہ پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں اگر جس دوام یا طویل قید یا بھاری جرمانے کی جگہ سزائے موت دی جائے تو سنگین جرائم کی ردک تھام موثر طریقے پر ہو سکے گی۔

تقریباً ایک دو سال ہوئے کسی اخبار میں یہ خبر نظر سے گذری تھی کہ ماسکو میں دو کاروباری آدمیوں کو جنہوں نے اشیائے خوردنی میں کچھ ملاوٹ کی تھی گوئی سے اڑا دیا گیا۔ قانون داں حضرات کہہ سکتے ہیں کہ یہ سزا جرم کے متناسب نہیں۔ بحث دمبا حشے کے لئے اس اعتراض میں بڑی جان ہے۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ دو آدمیوں کو عبرت ناک سزائے پوری سوسائٹی کو ایک طویل عرصے کے لئے اس قسم کے گندے اور مضر عناصر سے محفوظ کر دیا۔

سماج کو سماجی برائیوں سے محفوظ کرنے اور رکھنے کے لئے اگر بعض افراد کو ان کے جرائم سے زیادہ سزا مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایسی صورت میں جبکہ متناسب سزا کا رگرنہ ہو تو غیر متناسب سزا نہ صرف مناسب ہے بلکہ ضروری بھی۔ پاکستانی اخباروں میں آئے دن خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی وجہ سے اتنے افراد مفلوج ہو گئے۔ دڈ بس ڈرائیوروں کی دڈرگے باعث دلبسوں میں تصادم ہو گیا اور بیسیوں مسافر مجروح یا ہلاک ہو گئے۔ فلاں فلاں شہر میں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں ہر روز اغوا کئے جا رہے ہیں۔ میں نے ان خبروں کے ساتھ یا ان خبروں کے بعد کبھی یہ نہیں پڑھا کہ ملاوٹ۔ مسابقت اور اغوا کے مجرموں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی قید ہوتی ہے اور سب نتیجہ یہ ہے کہ ان جرائم کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رکنا۔

پاکستان کی انتظامی مشین کی ایک بہت بڑی خرابی اس مشین کے چلانے والوں کی رشوت ستانی ہے۔ غالباً پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے پوری قوم کو نہایت پر زور الفاظ میں اس کمزوری سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ جو قوم اپنے خدا کے احکام اور رسول کے ارشادات سے منحرف ہو گئی وہ اپنے قومی رہنما کی نصیحت کیا یاد رکھے گی۔ لیکن آج پاکستان کا حشر دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ قائد اعظم نے پاکستانیوں کو ان کی قومی زندگی کے آغاز ہی میں اس کی برائی سے کیوں متنبہ کیا تھا۔ شرع میں قوم رشوت کھاتی ہے۔ بعد میں رشوت قوم کو کھاتی ہے۔ اب ہم رشوت کے دوسرے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس مرحلے پر اس قومی گینسر کا اگر کوئی علاج ہے تو یہی کہ رشوت خور کلرکوں اور سپاہیوں کو نہیں بلکہ دس پانچ بڑے بڑے عہدے داروں کو سر میدان گوئی ماری جائے۔ رات بھر میں دولت مند بننے کی ہوس نے پاکستانیوں کے ہر طبقہ کو رشوت خور بنادیا ہے۔ ہماری قومی زندگی میں جو افراد اور ادارے اس کمزوری سے بالاتر ہیں ان میں زیادہ تر وہی افراد ہیں جو رشوت لینے کا طریقہ نہیں جانتے اور وہی ادارے ہیں جہاں رشوت کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ کم از کم ارباب تعلیم و تدریس یقیناً اس عیب سے مبترا ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے کانوں نے جو کچھ سنا ہے اس کے بعد مجھے اس فخر کا بھی حق باقی نہیں رہا۔

جو لوگ انسانیت یا انسانی ہمدردی کے نام پر بد کرداروں کے ساتھ نرم سلوک کا مشورہ دیتے ہیں وہ شاید نہیں جانتے کہ وہ اپنی انسانیت یا انسانی ہمدردی کو کتنے غلط موقع پر صرف کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ قوم کا خون چوسنے والوں کو معاف کر کے غیر محسوس طریقے پر قوم کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے لوگ رشوت خوروں کا سراڈا دینے اور چوروں کا

ہاتھ کاٹ ڈالنے کو انتہائی غیر انسانی فعل قرار دیتے ہیں لیکن رشوت خوردوں اور چوروں سے قوم اور افراد قوم کو جوتباہ کن نقصانات پہنچ رہے ہیں ان کو محسوس نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ خاندانی منصوبہ بندی کو پیدا ہونے والے بچے کے قتل کا مترادف قرار دے کر اس منصوبے کی مخالفت کرتے ہیں لیکن ان بچوں کا خیال کبھی نہیں ستاتا جو نادار ماں کے آغوش میں پیدا ہو کر مہذب زندگی کی ہر نعمت و عافیت سے محروم رہتے ہیں اور آخر کار نہ صرف اپنے والدین کے لئے بلکہ پوری سوسائٹی کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ یہ دیکھنا تو گوارا کر سکتے ہیں کہ خطرناک جنسی اور جلدی امراض میں مبتلا فقرا جاڑوں کی سردی اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں شہر کے فٹ پاتھ پر لیٹ کر یا بیٹھ کر بھیک مانگتے رہیں اور جن امراض میں خود مبتلا ہیں، ان کے جراثیم راہ چلتے صحت مندوں میں پھیلاتے رہیں لیکن ایسے لوگوں کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ سوسائٹی کے ان لاعلمیج بیکار، مضر اور کس مہر س عناصر کو سائنٹفک طریقے سے ختم کر کے ان کے اور سوسائٹی کے ایک مسئلے کو حل کر لیا جائے۔

میں نے اوپر کی سطوروں میں کہا ہے کہ جرم و سزا کے درمیان وقت کے فاصلے کو کم سے کم کیا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب محکمہ کو تواری اور عدلیہ کے موجودہ نظام میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ دونوں شعبے جو معاشرتی زندگی کی تنظیم میں حد درجہ موثر آلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انتہائی خراب و خستہ حال میں کیوں چھوڑ دئے گئے ہیں۔ انصاف کو ازراں اور سہل الحصول بنائے بغیر ایک اچھی سوسائٹی کا قیام بالکل ناممکن ہے۔ جو مقدمات پیچیدہ ہیں ان کا ایک طویل عرصے تک چلتے رہنا ناگزیر ہے لیکن بہت سے معاملات ایسے بھی ہیں جن کا فیصلہ وقت کے وقت ہو سکتا ہے یا کم سے کم وقت میں ہو سکتا ہے۔

کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ محکمہ کو تواری سے سماج کے شر پسند عناصر نہیں ڈرتے بلکہ شرفاء ڈرتے ہیں۔ اگر کسی کے یہاں چوری ہو جائے اور چور پکڑا جائے تو محکمہ کو تواری اور عدلیہ کے ہاتھوں چور کو اتنی پریشانی نہیں ہوتی جتنی اس شخص کو جس کے یہاں چوری ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ چور کو خود سزا دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا یقیناً مناسب نہیں سمجھتے جب کوئی اپنے آپ کو قانون کے ہاتھ میں دے کر محفوظ نہ ہو تو کیا کرے۔ چوروں کے لئے چھ مہینے یا سال بھر کی قید بالکل ناکافی سزا ہے۔ یہ طبقہ اپنی کامیابی کی صورت میں کسی فرد یا خاندان کو جس حد تک تباہ کر ڈالتا ہے اس کے پیش نظر اس کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالنا کوئی بڑی سزا نہیں۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسی وحشیانہ سزا ہے جسے کوئی مہذب ملک رد نہیں رکھ سکتا لیکن جس ملک کے پاس *Psychoanalysis* رکھ کر چوروں کا نفسیاتی علاج کرانے کی استطاعت نہ ہو وہاں چوروں سے بچنے کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے لئے کچھ خوفناک سزائیں مقرر کر دی جائیں۔

ہمارے ملک کے انتظامی شعبوں کے طریق کار میں جو طوالت اور پیچیدگی ہے وہ یقیناً ہمارے کردار کی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اب ضرورت اس کی ہے کہ طریق کار کو سہل بنایا جائے اور اس سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف شدید کارروائی کی جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ صدر ایوب (یا کوئی بھی صدر مملکت) ہر شعبے کی انتظامی تفصیلات مرتب کر کے راولپنڈی سے بھیجتے رہیں اور اگر وہ بھیجتے بھی رہیں تو کیا فائدہ جب تک متعلقہ افسر دیانتداری اور تن دہی کے ساتھ ان کی ہدایات پر عمل درآمد نہ کریں۔ مجھے ایک صاحب نے جن کی رائے میری نظر میں معتبر ہے بتایا کہ صدر ایوب نے سرکاری دفاتر میں سیکشن اوفیسر کی تخلیق جس نقطہ نظر سے کی ہے وہ نہایت مفید ہے لیکن چونکہ افسروں اور کلرکوں میں کوئی

ذہنی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی اس لئے لوگوں کو اس نے طریتی کار سے خاطر خواہ فائدے نہیں پہنچ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومی زندگی کے جن معاملات میں حکومت کوئی کوتاہی نہیں کرتی۔ وہاں بھی صورت حال جوں کی توں ہے۔ اس کا سبب متعلقہ لوگوں کی فرض ناشناسی اور بددیانتی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ بہر حال متعلقہ حکام کو خود سوچنا چاہئے کہ وہ اپنے شعبے کی مشینری کو کس طرح سادہ اور تیز رفتور بنا سکتے ہیں۔ مجھے مغربی پاکستان کے دفاتروں کا حال معلوم نہیں لیکن مشرقی پاکستان کے دفاتروں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام کو انجام دینے کی بجائے اٹکائے رکھنے کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ کسی دفتر سے کوئی معمولی سا کام بھی پڑ جائے تو بیس دفعہ دوڑے بغیر چارہ نہیں۔ بیس دفعہ دوڑانے میں کلرکوں کی کاہلی اور افسروں کی سہل نگاری دونوں کو دخل ہوتا ہے۔ یہاں کے دفاتروں کا عملہ اپنی میز کو صاف رکھنے کا عادی ہی نہیں۔ ہر دفتر میں ایک عنودگی کی فضا پائی جاتی ہے۔ آپ کسی کلرک سے اپنا معاملہ بیان کریں، وہ بیزاری کے ساتھ آپ کے منہ کو دیکھے گا۔ اذگھتے ہوئے ہاتھوں سے فائلوں کو ٹھوٹے گا اور یہ کہہ کر آپ سے پیچھا چھڑا لے گا کہ ایک دور دراز کے بعد آئیے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پاکستان کی آب و ہوا بڑی خواب آور ہے۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں بیرونی قوموں کے جو دفاتر ہیں ان کے عملے (جو بڑی حد تک پاکستانیوں ہی پر مشتمل ہیں) اوپر سے نیچے تک یہاں کی خواب آور آب و ہوا کے باوجود اپنے فرائض کی انجام دہی میں چاق و چوبند نظر آتے ہیں؟

فیلڈ مارشل مونٹ گو میری نے خرسچیف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ زرد فہم اور واضح دماغ کے مالک ہیں۔ ان سے کسی بات کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بڑے حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں..... ان کے دفتر کی میز کو دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اس پر فائل اور کاغذات نہیں تھے۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔

مونٹ گو میری نے خرسچیف کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ ایک غیر معمولی رہنما میں تو ہونی ہی چاہئیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب تک یہ خوبیاں پاکستانی دفاتروں کے افسروں اور کلرکوں میں کبھی پیدا نہ ہوں گی ترقی کے راستے پر ہم پھیلے گاڑی ہی کی رفتار سے چلتے رہیں گے۔

جو لوگ یہ سوچ کر مسرور و مطمئن ہو جاتے ہیں کہ سولہ سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ان کی حیثیت اس ماں کی ہے جو اپنے لڑکے کی کوتاہیوں پر کم عمری کا پردہ ڈالتی رہتی ہے۔ اس خود فریبی یا خلق فریبی کا انجام معلوم۔

(نگار) جناب نظیر صدیقی کا یہ مضمون ان کے نہایت دردمندانہ خلوص کا نتیجہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہی جذبات بعض دوسرے حضرات کے دلوں میں بھی پائے جاتے ہوں، لیکن اسے بے نتیجہ سی بات سمجھ کر وہ خاموش رہتے ہوں۔ اس لئے فاضل مقالہ نگار کی خرات یقیناً قابل احترام ہے کہ انھوں نے وہی بات جسے دوسرے لوگ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں بر ملا ظاہر کر دی اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق یکسر تعمیری جذبات سے ہے تو تدابیر اصلاح کے وہ پہلو جو بظاہر تخریبی نظر آتے ہیں بہت ضعیف اور ناقابل لحاظ ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کے تین حصے ہیں۔ ایک وہ جس میں انھوں نے پاکستان کی موجودہ ذہنی و اخلاقی پستی کا ذکر کیا ہے۔ دوسرا وہ جو یہاں کے عمال کی غیر ذمہ داریوں سے تعلق رکھتا ہے اور تیسرا وہ جس میں انھوں نے اصلاحی پہلو کے پیش نظر تعزیر کو سخت تر بنادینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بحث کے یہ تینوں پہلو اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو

اصول و بنیادی پہلو وہی ہے جو ذہن و اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور باقی دو تفریق ہیں۔ کیونکہ جب کسی قوم کی اخلاقی پستی دور ہو جائے گی تو لازماً اعمال حکومت کے اخلاق بھی بلند ہو جائیں گے اور عوام کی ذہنیت بھی اس سطح پر آجائے گی کہ تعزیری قوانین کی سخت گیری کا سوال ہی سامنے نہ آئے۔ بنا براں میرے نزدیک اصل سوال اصلاح اخلاق و معاشرہ کا ہے اور اسی پر انحصار ہے ایک ملک و قوم کی صحیح ترقی کا۔ لیکن یہ سوال ہے بڑا مشکل، کیونکہ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ اخلاق سے کیا مراد ہے اور اس کی صحت و بلندی کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک صرف ایک ہی حال پر قائم نہیں رہا بلکہ ذہنی ترقی کی نسبت سے اس کے تصورات درجانات، اس کے امیال و عواطف اور اس کے اصول کار میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے جو اس کی فطرت کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس لئے قدرتا معیار اصلاح کو بھی بدلتے رہنا چاہئے۔ یہ ممکن نہیں کہ اب سے ہزار سال قبل انسانی معاشرہ کے پیش نظر جو معیار اخلاق ذکر و قائم کیا گیا تھا وہی اب بھی معیاری سمجھا جائے، یا آج کے متعین کئے ہوئے اصول آئندہ ہزار سال کے رجحانات کے لئے بھی تسلی بخش ثابت ہوں۔ اسی لئے یہ سلسلہ اصلاح جس وقت میں اکابر مذہب کی زبان سے "قرون اولیٰ" کے اتباع کا ذکر سنتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے، کیونکہ قرون اولیٰ کا انسان تو قرون اولیٰ ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہ اب کہاں؟ اس وقت تو اسی انسان کو سامنے رکھنا ہو گا جو اس وقت کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ماحول کو بدلنے کی کوشش کرنا قانون قدرت سے جنگ کرنا ہے جس میں کامیابی ممکن نہیں۔ آج اگر انسان موٹر پر سفر کرتا ہے تو آپ اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ پیادہ پلٹا بیل گاڑی پر سفر کرے۔ آج اگر وہ نفیس خوشنما لباس پہنتا ہے تو اسے آپ لنگوٹی نہیں بندھوا سکتے۔ اگر آج وہ لذت و خوش مزہ غذائیں استعمال کرتا ہے تو آپ اسے "نان جویں" کی برکات کا یقین بھی نہیں دلا سکتے۔ اگر آج فنون لطیفہ اس کے مشاغل تفریح میں شامل ہو گئے ہیں تو نقاشی و موسیقی کی حرمت کے دغ سے کبھی اس کے موجودہ میلان کو نہیں بدل سکتے۔ (گویہ ترقیاں دراصل صرف انسان کی ہیں انسانیت کی نہیں) الغرض وہ چیز جسے ہم اصلاح و ترقی سے تعبیر کرتے ہیں اس کا کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں ہو سکتا۔ زمانہ کے رجحانات کے پیش نظر اس کا بدلتے رہنا ضروری ہے۔ پہلے انسان کے سامنے تنہا خود اس کی ذات تھی۔ اسکے بعد بیوی بچوں کا خیال بھی اس میں شامل ہو گیا۔ کچھ زمانے بعد عائلی تصور قائم ہوا اور اس کے بعد قومی و ملکی۔ مذاہب قدیمہ جن سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ روابط انسانی پر ملک و قوم کے محدود نقطہ نظر سے ہٹ کر غور کریں گے وہ بھی اپنا دائرہ نظر وسیع نہ بنا سکے اور ایک زمانہ اسی حال میں گزر گیا تا آنکہ مذہب اسلام وجود میں آیا۔ اور اس نے سب سے پہلے ملک و قوم رنگ و نسل کی تفریق کو نظر انداز کر کے انسان کو ایک انسان کلی اور نظام عالم کو پورے مجتمع بشری کا نظام قرار دے کر بالکل نئے اصول ترقی دنیا کے سامنے پیش کئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ذہنی انقلاب کو استوار ہونے کا موقع نہ ملا اور نصف صدی کے اندر ہی اندر یہ کارگاہ انسانیت ختم ہو گئی۔ اس کے متبعین میں بھی تفریق عرب و عجم امتیاز نسل و قوم کا پھر وہی احساس رد نما ہو گیا۔ ہیبت اجتماعی کا وہ بلند تصور جو اسلام نے پیش کیا تھا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسکی خونیں داستان سے ہر شخص واقف ہے۔ نہ جانے کتنے بیٹوں نے اپنے باپوں کا کتنے باپوں نے اپنے بیٹوں کا خون بہا یا اور کتنے بھائیوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹا۔ الغرض انسان ہمیشہ درندہ رہا ہے اور درندہ رہے گا یہ اور بات ہے کہ اس کے اصول و زندگی بدلتے رہے۔ چنانچہ آج آپ جن ممالک اور جن اقوام کی ترقی پر غبطہ کر رہے ہیں وہ بھی اپنی جگہ درندوں سے کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا نام دنیا کو دھوکا دینے کے لئے انھوں نے کچھ دوسرا رکھ دیا ہو۔ آپ نے جن ملکوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کی حالت پر اظہار افسوس کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھی اسی فریب میں مبتلا ہو گئے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ نے جن ممالک کا ذکر کیا ہے وہ بظاہر بہت ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ یعنی جس حد تک تفریحی عیش و نشاط، جسمانی راحت و آسائش و علمی اختراعات کا تعلق ہے۔ وہ بہت کامیاب ہیں۔ لیکن آپ کو کیا خبر کہ ان آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے مناظر کی تہہ میں کتنی ذہنی سوگواریاں درمعاشرہ کی کتنی روح فرسا داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر ترقی نام ہے صرف "نفس مطمئنہ" کے چھن جانے کا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ ممالک اس وقت ترقی کی بلند ترین منزل تک پہنچ گئے ہیں اور افسوس ہے کہ آپ انھیں ممالک کی تقلید میں، پاکستان کو بھی اسی منزل تک لے جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

آپ کو پاکستان سے یہ شکایت ہے کہ وہ ان ممالک کی تقلید کیوں نہیں کرتا اور مجھے یہ ردنا ہے کہ پاکستان میں کیوں ان کی تقلید کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کے کیرکٹر کا اتباع کریں اور میں یہ کہتا ہوں کہ انھیں اپنا قومی کیرکٹر خود الگ بنانا چاہئے۔

آپ نے یہاں کے عمال کی فرض ناشناسی اور سہل انکاری کا جو ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہاں اب تک کوئی قومی کیرکٹر متعین نہیں ہو سکا جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انگریزی تسلط نے اسے قصداً اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر اس درجہ خراب کر دیا تھا کہ اس خرابی کا احساس بھی ختم ہو گیا اور اس کا احیاء ثانیہ آسان بات نہیں۔

آپ نے اس کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ تعزیری قوانین کو سخت کر دیا جائے۔ لیکن میری رائے میں یہ تدبیر صحیح نہیں کیونکہ جس زمانے میں سارق کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا اس وقت بھی چوریاں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ جب زنا کی سزا سنگسار کرنا تھا اس وقت بھی اس کا انسداد نہ ہو سکا تھا۔ رہا سوال جان کا بدلہ جان سے لینے کا سو یہ دستور اب بھی جاری ہے لیکن واردات قتل میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ جرائم کا سرباب تعزیر دسزا سے کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے صرف نفسیاتی تبدیلی کی، اخلاقی اصلاح کی اور یہ مقصد صرف صحیح تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا یقیناً یہاں کوئی انتظام نہیں۔

نیاز مند

جس میں پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اس کا برادرب نے حصہ لیا ہے اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشا پر دازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات صحافی زندگی، شاعری ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایک ایسا مرقع ہے جو اس سلسلہ میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضخامت ۶۲۴ صفحات۔ قیمت :- آٹھ روپے

منیجر۔ نگار پاکستان۔ کارڈن مارکٹ

عراچی ۳



قومی انعامی بونڈ دستیاب ہیں

تمام ہیڈ اور سب پوسٹ آفس اب

- ★ انعامی بونڈ فروخت کرتے ہیں۔
- ★ انعامی بونڈ کیش کرتے ہیں۔
- ★ کیش شدہ یا واپس شدہ بونڈ بھی فروخت کرتے ہیں تاکہ لوگ انکو خرید کر اپنے پاس رکھیں اور کوئی انعام بغیر تقسیم ہونے نہ رہے
- ★ پانچ سو روپے سے کم رقم کے ہر انعام کیلئے درخواست وصول کرتے ہیں اور تصدیق کے بعد انکی ادائیگی کرتے ہیں۔

انعامی بونڈ



کنہ کے لئے بچائیے • قوم کے لئے بچائیے

ادھر ادھر کی

رشید احمد صدیقی

ریل کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خوش نصیبی ہے بشرطیکہ سفر فریج دوسرے کے ذمہ ہو! اس کے علاوہ حلیہ سر بخون جیسا، لباس صاف ستھرا، جس میں سب نہیں تو ایک آدھ کا کپڑا مل کا تیار کیا ہوا ضرور ہو۔ یہ اس لئے سمجھنا پڑتا ہے کہ بعض کپڑے حرب و نسب کے اعتبار سے تو نجیب الطرفین ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں خاصیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ دھلے ہوئے ہونے پر بھی دھلے نہیں معلوم ہوتے۔۔۔۔۔ اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم پر صاف کپڑا بھی صاف نہیں معلوم ہوتا خدا کے ایسے بندے بھی پائے جاتے ہیں جن کے جسم پر میل کپڑا بھی میلانظر نہیں آتا! یہ کرشمے کپڑے کے ہوں یا پہنے والے کے کچھ نہیں کہا جاسکتا! ممکن ہے اس میں ”غبار“ دھند، جالا“ وغیرہ کو دخل ہو جو فضا میں اکثر، میری آنکھ میں بیشتر اور سرمے کے اشتہارات میں ہمیشہ ملتے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اس سے بچنے کے لئے ستھرے ناشتہ دان میں گھر کا کھانا ہو۔ محقر مس یا صراحی میں پانی ہو۔ ہولڈال ایسا ہو جیسے اسی سفر کے لئے عز بیدا گیا ہو نہ یہ کہ لستر مرانی اڈوان یا میلی گرہ دار نوار کے ٹکڑے سے بندھا ہو ساتھ مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہراسٹیشن پر کورے گرد آلود آنچورے میں دودھ اور پتے میں دہی بڑے خرید کر شوہر کے لئے فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان خوبصورت خوش لباس اور خوش اطوار بیویاں یہ سارے کام انجام دینے پر مامور رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہوا تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہر نامدار کو مسلسل پسینہ پونچھتے رہنے کے لئے دیتی رہتی ہے اور شوہر صرف بنیان میں ملبوس، تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برقعہ پر چالیتا ہے کبھی فوراً ہی نیچے اتر کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا اور وہاں سے نکل کر نچلی برقعہ پر دراز ہو جائے گا اس کی یہ اور دوسری احتیاطی حرکتیں اس بات کی غازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں اسے وہ چین یا فضا نہیں میسر ہے جس کا دراصل وہ عادی ہے۔ تندرست ہونے کے شوہر کا سفر میں بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔

ہمسفر کی سیرت کا اندازہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے، نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ

فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کر کے وہ یہ سمجھنے لگتا ہو کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے بھی وہ بری ہو گیا۔ !
شریفوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اول درجے ہی میں نہیں تھوڑے کلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب
ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر مونگ بھلی، پکڑے، دی ہڑے، کھیرا، ککڑی یا آم وغیرہ کھانے پینے
اور ان کو گھبار ٹھنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس وحشی اور
گنوار نے غسل خانہ اور گھبار ٹھنٹ ایک کر دیا ہو۔

مجھے دولت پسند ہے۔ سب سے زیادہ اس لئے کہ اس سے میں دوسروں کو مستغنی الاحوال بنا
سکتا ہوں لیکن ایسے نو دولتوں کو چھٹے سے بھی چھوٹا پسند نہیں کرتا جو دولت کے زعم میں اقدار عالیہ کو نظر انداز کر دیتے
ہوں۔ اقدار عالیہ جتنے ہوں، ہوا کریں بذات خود میں نے اس میں حفظ مراتب اور صفائی ستھرائی کو بھی شامل کر رکھا
یہ ساری باتیں ناخواندہ مہمان کی طرح ذہن میں آگیتی۔ ظاہر ہے ایسے مہمان سے کسی نہ کسی طرح
اور جلد سے جلد گلو خلاصی کرنے کی فکر دامنیگر ہوتی ہے اس کا ایک طریقہ ہے کہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ناظرین کو
بھی اس میں شریک کرے۔ دراصل جو واقف بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک بار یونیورسٹی کے خرچ
پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کالے، کم رو، کم سخن، بشرے
سے بڑے ذہین اپنے سے مطمئن، دوسرے سے بے نیاز، عمر کے اس حصے میں جب وہ ہوتی تو ہے کسی قدر
زیادہ لیکن کم کر کے بتانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہنا پڑا کہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب اصل عمر سے
زیادہ بتانے میں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اپنے کو نہیں تو دوسروں کو !

گھبار ٹھنٹ میں داخل ہوا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف کو میرا آنا پسند نہ آیا ہو۔ حلیہ شریف کا کوئی
سوال نہ تھا، اس لئے کہ میری صورت دیکھ کر وہ کیا کوئی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ میں نے
نہایت شریفانہ لہجہ اور آداب کے ساتھ سلام کیا۔ اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا کہ میں ان سے آئندہ کسی
قسم کی توقع نہ رکھوں۔ ان کے اس سلوک سے دل ہی دل میں بہت محظوظ ہوا۔ بد دماغ سے بد دماغی کا منظر ہوتا
مجھے بڑا لطف آتا ہے جیسے وہ شخص اپنے ہی جو شانہ میں جوش کھارہا ہو۔ اس وقت مجھے وہ مثل یاد آتی
جو کہیں پڑھ چکا تھا۔ یعنی اس بد صورت عورت سے زیادہ بد دماغ اور مفزور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس
کی شادی ہو گئی ہو۔ !

ان کی طرح میں یا میری طرح وہ ٹرین سے سفر کے تو قائل تھے لیکن ٹرین کے آب دانہ کے نہ تھے اس لئے دونوں نے خورد نوش کا
انتظام پبلک سیکرٹ کے بجائے پرائیویٹ سیکرٹ سے کر رکھا تھا۔ ان کا ناشتہ دان تا چینی کا تھا۔ میرا المونیم کا جہاں
تک اندازہ لگانے کا تعلق ہے، خوراک فرو کرنے کی جو صلاحیت بظاہر ان میں معلوم ہوتی تھی اس کی
روسے ان کا ناشتہ دان بڑا اور اسی اعتبار سے میرا چھوٹا تھا۔ اسی سے ناشتہ دانوں کی مشمولات و مقدار
کا بھی حساب لگایا جاسکتا ہے، میکے پاس پانی کی صراحی اور گلاس تھا۔ انھوں نے اس کا انتظام بوتلوں
میں کر رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی اٹیل کر پیتا تھا۔ وہ براہ راست بوتل سے پیتے تھے ان کا پینا
بالجہر ہوتا میرا بالستر۔

میں دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر چلا تھا۔ یوں بھی ایک لڑکے نے میں میں کھانے میں نہ وقت کا پابند تھا نہ بھوک کا۔ جب ملا جلا ملا کھا لیا۔ کبھی دو ایک وقت پٹشنگی کا بھی۔ یوں بھی کھانے کے فن کاروں نے بتایا ہے کہ کھانے کے لئے بھوک کو نہیں مواقع کو اہمیت دینی چاہئے۔ اسی طرح اگر دو ایک وقت کھانا نہ ملے یا طبیعت کے مطابق میسر نہ آئے تو آمادہ فساد نہ ہونا چاہئے۔ شریف آدمی کو کھانے کا کھانا بالضرور مل کر رہتا ہے۔

گھر سے کھا کر چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے۔ روکھا پھیکا روزمرہ کا کھانا تو حسب معمول گھر پر کھایا اس طرح اچھے ناشتہ کی مقدار میں جو ہر سفر سونے والا تھا گھی نہ آتی۔ دوسرے گھر والوں کا کہنا یہ تھا کہ سفر شروع نہ ہو چکا ہو تو سفر کے کھانے میں ہاتھ لگانا کیسا! پھر یہ بھی ممکن ہے راستے میں دوسرے کو بھی شریک دسترخوان کرنا پڑے تو کھانے کی کمی کی وجہ سے اسی کی نوبت نہ آئے کہ ایک دوسرے سے تا اختتام سفر الٹھ نہ ملا سکیں! اس لئے میں سفر میں ناشتے کی مقدار ذرا زیادہ بچا رکھتا ہوں!

پنج کا وقت آیا۔ ہر سفر نے ناشتہ دان کھولا۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ جسے انھوں نے اس رعبت سے اتنا جلد جلد اور اس مقدار میں کھانا شروع کیا جیسے وہ اپنا نہیں کسی دوسرے کا کھانا کھا رہے ہوں! میں اس کا منتظر تھا کہ رسایا اخلاقاً مجھے بھی شرکت کی دعوت دیں گے۔ چونکہ میرے پاس خود کھانے کا سامان موجود تھا اس لئے انھیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ دعوت دینے کا بدلہ میں بھی کر سکتا تھا لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کھانے کے معاملے وہ ہر شے کو یقین پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔

انھوں نے مطابق التفات نہ کیا تو میں غور میں پڑ گیا کہ یہ کس قبیلہ یا قماش کے آدمی تھے کہ اتنا معمولی اور بے حرز آداب ملحوظ رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وہ کچھ اس طرح کھانے کے شغل میں منہمک رہے کہ میں ان کی ولایت قومیت، سکونت، دار و حال وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے نہ قائم کر سکا وہ کھاتے رہے اور میں پیچ و تاب میں مبتلا رہا۔ یکایک انھوں نے ایک مسلم پاز نکالی اور اوپر کا ہلکا پھیکا سرخ چھلکا دور کر کے براہ راست دانتوں سے کاٹ کر اس طرح اس کو کھانا شروع کیا جیسے وہ پیاز نہ تھی آرٹو یا آلوجہ تھا اس کے بعد کچھ دیر تک طرح طرح کی مٹھائیوں سے شغل فرماتے رہے ایک بوتل کا نصف پانی غٹ غٹ پی گئے۔ اور اطمینان کا دھکار آہنگ، سانس لیا۔ ناشتہ دن بند کر دیا اور باوجود اس کے کہ گرمی کا موسم تھا، سر سے پاؤں تک کھل کر لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، کھل کا اور ٹھنڈا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ زرا دیر میں خراٹے کی آواز آنے لگی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے سونے میں خراٹے کی آواز اور با آواز بلند ڈنکار لینے سے بڑی وحشت ہوتی ہے وحشت کی بجائے کوئی اور لفظ لکھنا چاہتا تھا لیکن ”سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا“ کی بنا پر جہاں کا تھاں رہ گیا۔

سارے چلق رہی وہ خراٹے لیتے رہے اور میں سوچتا رہا کچھ اس طرح سے سوچتا جس پر دیکھنے والوں کو اونگھنے کا گمان ہو۔ ایک بڑے اسٹیشن پر بھاری رکی۔ پلیٹ فارم پر ان کی پذیرائی کے لئے اتنے اور ایسے

ایسے لوگ نظر آتے کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ ان کی پذیرائی میری گرفتاری پر نہ ختم ہو۔ کچھ بڑے لوگ پلیٹ فارم پر مودبانہ ہاتھ ملانے لگے ان سے چھوٹے اٹینشن "تھے۔ اور جوان سے بھی کمتر درجے کے تھے وہ کمپارٹمنٹ سے سامان اتارنے کے لئے اس طرح پھٹے کہ میں سمٹ کر اپنی سیٹ کے گوشے میں پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار "اسباب بغاوت بند" کو بھی حراست میں نہ لے لیں۔ جس ہنگامے پر کمپارٹمنٹ اور پلیٹ فارم کی رونق تھی وہ کچھ ماند پڑی تو اپنے ہی جیسے چلے اور اوقات کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ انھوں نے نام القاب اور منصب بتائے تو اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ ان کے بارے میں خیال تھا وہ صحیح تھا اور کھانے پر رسماً بھی مدعو نہ کرنے اور سموچے پیاز علی الاطلاق کھانے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔

ایک کام کے سلسلہ میں کئی سال یونیورسٹی لائبریری جانا پڑتا تھا جہاں دفتر واقع تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت کے سامنے دو دوڑنگ شوق شہادت میں شرابور (غالباً گرمی کا موسم تھا) بھڑکیلے زنگ کی قمیصوں اور چست تپلونوں میں ملبوس یونیورسٹی اور اطراف و جوانب کے نوجوانوں کا ہجوم متلاطم ہے مجمع بڑھتا جاتا تھا اور اس کے بے قابو ہونے کے آثار بھی پیدا ہو چلے تھے۔ قریب کے ایک صاحب سے پوچھا "یہ ماجرا کیا ہے؟"

پہلے تو انھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے ان کے سامنے میں نہ تھا اصحاب کہف میں سے کوئی صاحب تھے۔ پھر بولے، آپ نہیں جانتے کہ لائبریری میں آج ایک فلم کی شوٹنگ سونیوالی ہے۔ ایک کمپنی آئی ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا تو اس میں کیا حرج ہے، فرمایا ہیرو اور ہیروئن کو ہماری نئی خوبصورت لائبریری میں مصروف مطالعہ یا معاشقہ دکھانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، یہ تو بچوں بھی ہوتا رہتا ہے۔ کہنے لگے آپ کہیں باہر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یو آئینٹ یہ ہے کہ لائبریری، یونیورسٹی اور "تابہ ثریا از ان ماست" ہیرو ہیروئن بننے کا مہلا حق ہمارا ہے ورنہ پھر یہ کیا جائے کہ ان دونوں میں سے ایک پبلک سیکرٹری کا ہو دوسرا پرائیویٹ کا۔

میں نے کہا پرائیویٹ اور پبلک سیکرٹری کا دروسر تو حکومت کا ہے۔ ہم آپ اس جھگڑے میں کیوں پڑیں ہمارا آپ کا درد قویج دوسرا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے ہر ڈرامے میں ہیرو ہیروئن کے علاوہ ایک اور کردار ہوتا ہے۔ جاندار ہوتا ہے۔ بولے وہ کیا۔ میں نے کہا ولین کا! ایک مسخرے کی بھی ضرورت ہوگی۔ پہلے پر آپ اکتفا کیجئے دوسرے پر میں! اس وقت تو ان فلم والے غریبوں کو پیٹ کا دھندل کر لینے دیجئے۔ ہم آپ تو ہمیری ہیں کہیں اور راستہ نکال لیں گے۔ مسکرا کر بولے۔ "مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو" میں نے مودب ہو کر داد دی تو گرج کر فرمایا "ہر کہ شمشیر زہر سکتا بنامش خوانند" مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب جبکہ یہ شعر پڑھتے لگے ہیں کچھ نہ کر پائیں گے۔

اتنے میں ایک جوان، سادہ لباس میں نمودار ہوئے۔ غالباً پولیس کے محکمہ سے تعلق رکھتے تھے، پوچھا کیوں جی یہ کون تھا جس نے ابھی ابھی کمرپان کا نام لیا تھا۔ میں ڈر گیا اور "..... من نہ بودم" کہتا

ہوا آفس میں جا چھپا۔ سٹورٹی ویرلج جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجمع منتشر اور میدان صاف ہو گیا ہے۔ تعجب ہوا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگائے اور آس پاس کا علیہ بگاڑے بغیر مجمع کس طرح لپٹا ہو گیا۔ بتایا گیا کہ ارباب یونیورسٹی نے سمجھایا، پولیس نے دھمکایا فلم والوں نے راہ فرار اختیار کی اس لئے ہتھاشانہ ہوا!

بات آئی گئی ہو گئی۔ "جاڑا گئی، بہار، برسات" اور ان کی صبح و شام اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ گزرنے لگے جن کو میں زندگی کا ناقابل برداشت خلیان سمجھنے اور محسوس کرنے لگا ہوں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب "سہرت میں نیاسماں نئی بات" پاتا تھا۔ خیر، یہ بات تو برائے بیت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ از کار رفتہ اور تقریباً "مال بعد الطبیعات" ہو جانے کے باوجود یہ خیال برابر آتا رہتا ہے کہ تیمور کی گھر کی حمیت کہاں گئی اور کیوں گئی؟ کیوں گئی اس کا جواب تو واضح ہے یعنی "شامت اعمال" کی زد میں آ گئی۔ رہا یہ کہ کہاں گئی اس کے بارے میں گمان ہوتا ہے وہ کہیں گئی نہیں ہے۔ ہفتہ ستارے کا سدھ ہو کر رہ گئی ہے اس لئے کوئی اس کا خواہاں نہ رہا۔

جہاں سننے، جہد و یکھنے نوجوانوں کا یکساں حال ہے ایک زمانہ تھا برآیا بھلا۔ جو بخل خلاق و عادات میں۔ نوجوان اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کی تقلید کرتے تھے اب بوڑھے اور بزرگ نوجوانوں کے اخلاق، عادات، لباس اور طور طریقوں کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بوڑھوں کا یہ طریقہ جتنا مضحکہ خیز ہے اتنا ہی عبرت انگیز بھی ہے۔ یوں تو زمانے کا دستور ہمیشہ سے یکساں چلا آتا ہے۔ لیکن ایک نئی بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ پہلے زمانے میں بوڑھا ہونے سے کچھ قبل ہی لوگ اپنے کو بوڑھوں کے زمرے میں شمار کرنے لگے تھے۔ اور اسے شرافت اور وضاحت کا تقاضا اور امتیاز سمجھتے تھے اب بوڑھا ہونے پر بھی اپنے کو بوڑھا سمجھنا عار سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنے کو نوجوانوں سے بھی زیادہ نوجوان قرار دینے جانے کی فکر میں رہتے ہیں کہتے ہیں اسی طرح کی خود فریبی سے عمر بڑھتی ہے۔ عقل گھٹتی ہے تو گھٹتی رہے!

اب صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ فرد ہو یا جماعت اپنے کو ہر طرح کے احتساب سے آزاد سمجھتی ہے جس کے جی میں جو آتا ہے کر ڈالتا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو اب گناہ گناہ نہیں رہا مان یہ لیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب برا نہیں صرف اپنی احتیاط ضرور کر لینی چاہئے کہ ملک کا قانون گرفت میں لے کر سزا نہ دے دے۔ رہے اخلاقی گناہ ان کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہئے۔ ایسے معاملات میں دخل دینا فرد کی آزادی فکر و عمل میں مغل ہونا ہے جو سب سے بڑا گناہ یعنی (BAD TASTE) یا رکاکت ہے۔ مثلاً ناداری اور بھوک سے مجبور ہو کر کوئی بد لفظ یا ناج یا ایک ادھر دنی چڑا لے تو اس کو جیل خانے بھیج دیا جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زد و کوب کرتا رہے اور دوسری بیوی سے التفات کرے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں حائل ہونا بد مذاقی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اچھے یا بُرے شخصی اعمال ہی سوسائٹی کے قوام کو نبھاتے یا بگاڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شخصی یا نجی بد اعمالی جس کو ہماری تہذیب نظر انداز کرتی ہے وہی قومی و اجتماعی بد اعمالی کی محرک عظیم ہوتی ہے۔

اسے ایک تسلیم شدہ اصول مان لیا گیا ہے۔ کہ جو خرابیاں ہم اپنے ارد گرد پاتے ہیں ان کے اسباب جہالت افلاس، بیماری اور ناموافق ماحول ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری کوششوں سے ان مصائب میں بہت کچھ کمی آگئی ہے اور تبدیلی آتی جا رہی ہے جسے بحیثیت مجموعی ہم نے معیار زندگی کی بلند سی کمانا دے رکھا ہے۔ پھر کیوں ہے ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شدنی بلینم۔

معیار زندگی کے اوسنچا ہونے سے معیار اخلاق کیوں ادنیٰ نہیں ہوتا؟ ایسا تو نہیں، اس نظریے میں کوئی مغالطہ رہا یا گیا ہو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے گمان یہ ہوتا ہے کہ یا تو معیار زندگی کے نشیب و فراز کا کوئی معیار اخلاق کے نشیب و فراز سے نہیں یا پھر معیار زندگی کو ہر حال میں بڑھانا چاہیے، معیار اخلاق اپنی صحت و سلامتی کے لئے کوئی دوسرا دروازہ دیکھئے!

زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لئے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں وہ ٹھیک ہیں لیکن اس کی ضرورتوں سے بچنے اور بچانے کے لئے اخلاقی اقدار کو موثر و مستحکم کرنے کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جوامع و ذماتم غیر ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جوامع و ذماتم سے کہیں زیادہ سنگین اور دوسری ہوتے ہیں۔ معیار زندگی کو یکطرفہ ترقی دینے کے خطرات کی طرف توجہ کم مائل ہوتی ہے، شاید اس لئے کہ ثواب کمانے سے کہیں آسان گناہ سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اس طرح کے دور از کار خیالات میں دیر تک اڑنگھٹا رہا اس کے بعد زندگی کے معمولات شروع ہو گئے اور جنس پندار و کہ اس کشاکش با اوست کا طلسم ٹوٹ گیا۔

علی گڑھ کا گرمی کا زمانہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس موسم میں قضا و قدر ہم سے آدمیت کا شرف چھین لیتے ہوں۔ گرد، مگرمی، تیز لو، تمام موجودات پر کرب و کرباہ کا عالم! موت سے ڈرنا تقاضائے فطرت ہے لیکن ہر قیمت پر زندہ رہنے کی خواہش بھی کسی لعنت سے کم نہیں! ساری زندگی نیکنای میں بسر کرنے کے بعد علی گڑھ میں گرمی کے زمانے میں مزاحمتی ہی بدلی ہے۔ دوڑ دھوپ، بچہ و تکھن کا انتظام، غریبوں اور شریفوں کا میت کو دفنانے قبرستان لے جانا اور وہاں دیر تک انتظار کی رحمت اٹھانا بڑا تکلیف دہ خیال ہے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی بچہ و تکھن میں شریفوں کو اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال مرنے والے کے لئے کسی طرح موجب فخر نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح کے خیالات غالب کے رہے ہوں گے جب انھوں نے یہ لافانی شعر کہا تھا۔

ہوئے مرگے ہم جو رہو ہوں کیوں نہ عنرق دریا

نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں منہ اڑ ہوتا

— اس بارے میں غالب اتنے غور و فکر کہ مرنے سے ایک منزل پہلے کی بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا مشہور قطعہ کا صرف آخری شعر کہہ دینا کافی ہو گا۔

پڑے مگر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار

اور اگر مر جائے تو نوہر خواں کوئی نہ ہو!

— جب کبھی موسم نہایت درجہ خواب ہوتا ہے۔ تیوہار یا آس پاس کوئی اور تقریب ہونے والی ہوتی ہے

تو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ایسے مواقع پر میری موت واقع نہ ہو۔ نارمل حالات میں چاہے جب ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔

لندن میں دو شنبہ کا ۸ سے ۱۰ بجے دن تک کا وقت، آفس یا کارخانہ وغیرہ کے ملازموں کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے کام پر ٹھیک وقت پہنچنا چاہتا ہے۔ زیر زمین بجلی سے چلنے والی گاڑیاں بڑی پابندی اور تیزی سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی ایک دو شنبہ کو ۸ — ۱۰ بجے دن کے درمیان چلتی گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا کر ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ گاڑی روک دی گئی اور نغش کو علیحدہ کئے جانے کا انتظام کیا جانے لگا اس میں کچھ وقت صرف ہوا۔ سواریوں میں سے ایک خاتون نے اکتا کر فرمایا: ”کج بخت کہ خودکشی کے لئے دو شنبہ ہی کا دن اسی گاڑی اور اسی وقت کا انتخاب کرنا تھا!“

ایک دن گھر کی انتہا پر تھی۔ لائبریری سے نکل کر دیکتی دھوپ اور تیز لومیں گھر والپس آ رہا تھا۔ سڑک پار کی تو حاشیہ پر لگے ہوئے ایک جید درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا جسم پر صرف ایک میلی پھی لنگی تھی چھری سنبھالتا جھکڑے بچتا جلد جلد رماں سے گزرا غور سے یہ دیکھنے کی نہ ضرورت سمجھی نہ ہمت بڑی کہ کون شخص تھا اور رماں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دور نکلا تھا خیال آیا کہ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ آواز سنی تھی جس کام میں نے کچھ خیال نہیں کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ کوئی فقیر ہو گا جس نے پیسے مانگے ہوں گے۔ کچھ دور جانے کے بعد بھوک اور بوسم دونوں کی سختی اور زیادہ محسوس ہوئی تو فقیر کا خیال آیا کہ اس پر معلوم نہیں کیا گزر رہی ہو گی۔ بادل نا خواستہ پلٹا۔ جیب سے کچھ پیسے نکلے اور اس شخص کے پاس آ کر کہا یہ لو تمھاری آواز اچھی طرح نہیں سن سکا تھا۔ قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں پر ابلی ہوئی ترکاری اور ساگ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑ ہو گیا اور بڑے اعتماد لیکن انکسار سے کہا۔ ”میاں اللہ آپ کو اچھا رکھے، آپ کو دھوکا ہوا میں نے کچھ مانگا نہیں تھا کھانے کا وقت تھا میں کھا رہا تھا آپ بھی شاید بھوکے گزر رہے تھے۔ منہ سے نکل گیا۔“ ”میاں کھانا حافر ہے۔“ آپ کے لائق یہ ساگ اور سوکھی روٹی نہ تھی لیکن باپ دادا کی ڈالی ہوئی عادت کو کیا کہوں، کھانا کھاتے وقت کسی کو پاس دیکھتا ہوں تو اس طرح کی بات منہ سے نکل جاتی ہے۔ کوئی شریک ہو جاتا ہے تو دل خوش ہو جاتا ہے نہیں ہوتا جب بھی ایک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ مزدوری میں جو پیسے مل جاتے ہیں اس سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اس کا شکریہ ہے۔ محنت مزدوری سے سارے کام چلا تا رہتا ہوں۔ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں!“

میں نہایت شرمندہ ہوا اور اس مزدور کے فقر غیور کے مقابلہ میں اپنے تمام مناصب و مراتب پر لغت بھیجتا ہوا گھبراہٹ سے پہنچ گیا۔

پروفیسر سید جلیل الرحمن اعظمی کی تالیف جو عرب کے مشہور شاعر متنبی کی معجزنا

ابوالطیب متنبی

شاعری، سوانح حیات، مختلف ادوار شاعری، خصوصیات و

امتیازات محاسن و روائع کا بیہ مثال مجموعہ اور عربی ادب کے بے شمار تنقیدی جواہر پاروں کا

قیمت ۱۔ دس روپے (علاوہ محمولہ ڈاک)

بے بہا گنجینہ ہے۔

عباسی دور میں شاعری کے رجحانات

محمد ظہیر تقا ایم اے؛ فاضل دیوبند

نوجوانوں کے دور تک پہنچتے پہنچتے عربوں کی معاشرت میں جو زمین و آسمان کا تغیر آگیا تھا اس کا اثر ان کی شاعری میں بھی رہتا ہے۔ امت عربیہ بے حد اوت سے حضارت کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ ریگستان کی طوفانی فضا میں اُن کے خیمہ میں رہنے والا بدو اب پرسکون محلوں میں رہتا ہے۔ کل تک جس کے بدن پر اون کا لباس ہوتا تھا، آج دیباہ و حریر اسکے جسم کی زینت بنا ہوا ہے۔ جسے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی، دولت کی فراوانی نے اس کے سامنے خوانہائے نعمت چُن دیئے ہیں۔ کل تک اطلال (کھنڈرات) پر رونے کے لئے جسے فرضی ہمنشیں سے خطاب کرنا پڑتا تھا آج وہ اپنے شہستان میں حسین کنیزوں کے جھرمٹ میں چنگ و رباب کی دھنوں پر مست ہے۔ کل تک جسے صاف پانی بھی مشکل میسر آتا تھا آج اسکے لئے روح پرور شراب کے جام گردش میں ہیں۔

ان حالات میں عباسی دور کی شاعری میں بھی لازمی طور سے تغیر آنا چاہئے تھا۔ جب معاشرتی حالات میں تغیر آجائے تو ادب و شعر میں بھی تغیر آنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اموی دور کی شاعری سے کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔

(۱) جاہلی شاعر اپنے قصیدہ کو تشبیہ سے شروع کرتا تھا (یہی اس کی غزل تھی) اور تشبیہ کی ابتدا بھی رحیل کا رواں کے ذکر یا کھنڈروں پر آنسو بہانے سے ہوتی تھی۔ اموی شاعر نے اس جاہلی طریقہ نظم کی پیروی کی اس لئے کہ اموی دور میں عربیت اور بدایت کا رنگ غالب تھا اسی لئے وہ جاہلی شاعر کو اپنے سے برتر اور اپنے لئے قابل تقلید مانتا تھا۔ لیکن عباسی دور میں عربیت پر غمیت اثر انداز ہوئی اور بدایت حضارت سے شکست کھا گئی نتیجہ یہ ہوا کہ بدلے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس دور کے شعراء نے بھی جاہلی شعراء کی تقلید کے جوئے اپنی گردنوں سے اتار پھینکے اور قدیم طریقہ نظم سے بغاوت کر کے جدید روش کی بنیاد ڈالی۔ اس بغاوت کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو شاعر کھل کر میدان میں آیا ہے وہ ابو نواس ہے۔ اس نے کھنڈرات پر رونے کے بجائے عموماً دخت رز سے اپنی غزلوں کی ابتدا کی۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتا ہے:-

صفة الطلول بلاغة القدم فاجعل صفاتك لابنة الكرم

کھنڈرات کا ذکر قدماء کی بلاغت تھی۔ (اے ابو نواس) تو دخت رز کا ذکر کیا کر۔

ایک اور جگہ کہتا ہے:-

ودع قفانبك وعرا صاتها لا مرحم الله امر القيس

اور قفانبك اور عرا صاتها کو چھوڑ، خدا امر القیس پر رحم نہ کرے

لے اس شعر میں امر القیس کے مشہور معلقہ کے صنفیل و شعروں کی طرف اشارہ ہے۔ (دوسرے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

ابو نواس کی بعض غزلیات و قصائد میں اگر کھنڈرات پر رونے کا ذکر ملتا ہے تو اس وجہ سے نہیں، وہ طوعاً قدما کے طریقہ کی پیروی کرنا چاہتا ہے بلکہ کمتر اس لئے کہ عام مذاق ہنوز روایت کا غلام تھا۔ اور بیشتر اس لئے کہ اس معاملہ میں خلیفہ کی طرف سے اس پر جبر بھی کیا گیا اور اس جبر کا ثبوت اسکے بعض اشعار سے بھی ملتا ہے۔ کہتا ہے:-

اعر شعرك الاطلال والمنزل القفر
فقد طالما انررى به نعتك الخمر
اپنے شعر کو (اے ابو نواس تو) کھنڈرات اور ویران مکان (کا ذکر) عاریت دیدے اس لئے کہ شراب کی توصیف کی وجہ سے بسا اوقات تیرے شعر کی بے قدری ہوتی ہے۔

دعانی الى نعت الطلول مسلط
تضيق ذراعى ان اسر دله امر
ایک با اقتدار ہستی نے مجھے کھنڈرات کی توصیف کی دعوت دی ہے اور میری مجال نہیں کہ اس کی بات ٹال سکوں۔
فسمعا امیر المومنین وطاعة
وان كنت قد حشمتنى مركبا وعرا
پس اے امیر المومنین اگرچہ آپ نے مجھے بڑے دشوار کام کا حکم دیا ہے لیکن میں آپ کا حکم سننے اور بجالانے کے لئے حاضر ہوں۔
(۲) جاہلی شاعر کے الفاظ اور اس کی استعمال کردہ ترکیبیں فصاحت و بلاغت کا معیار سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اموی شاعر نے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے جاہلی بدو سے کم نہ تھا، اس معیار کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اور یہ ترکیبیں چونکہ ایک وحشی قوم کی تھیں اس لئے ان میں وحشت کا پایا جانا ناگزیر تھا اور مدنیت کی فضا کے لئے یہ سازگار نہ تھیں۔ اس لئے عباسی دور میں الفاظ میں بھی تغیر آیا اور ترکیبوں میں بھی۔ اس دور میں چونکہ غزل ترقی کر گئی ہے اور غزل کی لطافت الفاظ کی خشونت اور تراکیب کی وحشت کو برداشت نہیں کر سکتی اس لئے اس دور میں نسبتاً نرم و شیریں اور روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ غزل کے لئے اختیار کیے گئے اور مانوس ترکیبیں اپنائی گئیں۔
(۳) شعر کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ عقل انسانی ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن خیال شعری کے اعتبار سے وہ ترقی معکوس کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے ہومر اور انگلستان کے شکسپیر سے شعراء متاخرین سبقت نہ لیجاسکے۔ اسی قسم کا خیال تھا ابتداء عرب شعراء کا کہ جاہلی شعراء نے ایسا کوئی قابل ذکر مضمون نہیں چھوڑا جس پر طبع آزمائی کی جاسکے۔ چنانچہ عنترہ بن شداد اپنے اس مشہور قصیدہ کی ابتداء جو سبع معلقا میں شامل ہے اس مصرع سے کرتا ہے:-

هل غادر الشعراء من متردم
پہلے کے شعراء نے کیا کوئی پوند لگانے کی جگہ چھوڑی ہے۔
اگر یہ خیال صحیح بھی ہو تو صرف اسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ بدوی زندگی کی حدود میں جن چیزوں تک بدو شاعر کے تخیل کی رسائی ہو سکتی تھی، زیادہ سے زیادہ جاہلی شاعر نے ان مضامین کا احاطہ کر لیا ہوگا۔ لیکن جبکہ مدنیت کی انہیں ہوا بھی نہ لگی تھی، کیسے ممکن ہے کہ ان کے خیال کی وسعت میں وہ چیزیں بھی آگئی ہوں جو مدنیت اور حضارت کی پیداوار اور انہی کا خاصہ ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ فکر انسانی میں جوں جوں ارتقاء ہوتا رہا خیال شعری میں بھی وسعت ہوتی رہی اور وسعت خیال کے اعتبار سے اموی شعر جاہلی شعر سے اور عباسی شعر اموی شعر سے کہیں فائق ہے۔ عباسی

بسقط اللرى بين الذخول فحول

(۱) قفانك من ذكرى جيب ومنزل

وقيعانها كانها حب فلفل

(۲) تری بعر الاسرام فی عرصاتها

اے میرے دونوں ہمسفر ذرا ٹھہراؤ کہ محبوب اور اسکے اُس جائے قیام کو دیکھ کر رو لیں جو دخول اور حوصل کے درمیان ہے۔

میں ان (ویران مکانوں) کے صحنوں اور میدانوں میں ٹیل گایوں کی میگیں اس طرح نظر آئیں گی گویا وہ سیاہ مرج کے دانے ہیں۔

دور کی تشبیہات میں جو ندرت اور بلندی ہے اس سے پیشتر کے دور کے شعراء کے کلام ان سے یکسر فانی ہیں۔ مثلاً امر القیس میدان میں پڑی ہوئی نیل گایوں کی مینگیاں دیکھ کر انہیں دانہ ہائے فلفل سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے:-

تري بعرا الامام في عرصا تھا
وقيعا نھا كانھا حب فلفل
تہیں ان (ویران مکانات) کے صحنوں اور میدانوں میں نیل گایوں کی مینگیاں اس طرح نظر آئیں گی گویا وہ مرج سیاہ کے دانے ہیں۔
اس کے مقابلہ میں ایک تشبیہ ابن المعتز کی ہے جس کی قدما میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ کہتا ہے:-

وتحت زنا نيرشدون عقودھا
زنا نير اعکان معاقدھا السرد
اوپر زنا میں خنیں گرہ لگا کر باندھا گیا ہے اور ان کے نیچے پیٹ کی شکنیں ہیں جن میں زنا کی طرح ناف کی گرہ لگی ہوئی ہے۔
اسی طرح ابو تمام کہتا ہے:-

واذا ساد الله نشر فضيلة
طويت اتاح لها لسان حسود
اشر جب کسی پوشیدہ خوبی کو مشہور کرنا چاہتا ہے تو حاضر کی زبان اسکے پیچھے لگا دیتا ہے۔
لولا اشتعال النار فيما جاورت
ما كان يعرف طيب عرف العود
اگر آس پاس آگ نہ لگے تو عود کی خوشبو کیسے پھیلے۔

(۴) اس دور میں چونکہ دوسری اقوام کے قدیم علوم و فنون کے عربی میں تراجم ہو چکے ہیں اس لئے اس دور کے شعراء نے قدیم اجنبی خطباء و شعراء کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور فلسفیانہ اصطلاحات و تعبیرات کو اپنے اشعار میں اپنا یا ہے۔ مثلاً ابونواس کہتا ہے:-

يا عاقد القلب مني
تركت فلي قليلا
يكا لا يتجزى
هل لا تذكرت حلا
من القليل اقلا
اقل في اللفظ من لا

اے میرے دل کو جکڑ دینے والے کیا تجھے کشائش کا ذرا بھی خیال نہیں تو نے میرے دل کو قلیل سے اتنا اقل کر دیا ہے کہ اس کے مزید اجزاء ہو سکیں اور جو لفظ آ سے بھی کم ہو گیا ہے۔

يا مثلاً اسکندر یونانی نے اپنے بیٹے کی موت پر جو کچھ کہا تھا اسے ابو العباس نے ان الفاظ میں موزوں کیا ہے:-
كفى حزنا بد فناء ثماني
وكانت في حيوتك لي عطات
نفضت تراب قبري من يد يا
فانت اليوم او عظمته حيا

تیرا دفن ہی میرے غم کے لئے کافی ہے اس پر مستزاد یہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے تیری قبر کی مٹی بھی جھاڑ رہا ہوں۔
حیری زندگی میں بھی میرے لئے بڑی عبرتیں تھیں لیکن زندگی کے مقابلہ میں آج تو میرے لئے زیادہ باعث عبرت ہے۔

(۵) شراب عیش پرستی کا لازمی جز ہے۔ عباسی دور کا اعلیٰ اور متمول طبقہ جن کی زندگیوں پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے عیش پرستی اور شراب نوشی کا شکار ہے۔ شعراء کا طبقہ اس اعلیٰ طبقہ کا ندیم اور پیرو ہے اور خود بھی شراب کا عادی ہے اس لئے ان کی شاعری بھی شراب کے ذکر سے لگن ہے۔ شعر میں شراب کی توصیف کرنے والے شعراء میں ابونواس سب سے آگے ہے۔ اس کے دیوان میں ہزاروں اشعار ایسے ہیں جن میں شراب کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابونواس کو یقیناً شراب کی توصیف کرنے والے شعراء کا امام کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:-

ما زلت استل روح الدن فی لطفِ واستقی دمه من جوف معجروح

حتی انتیت ولی روحان فی حسدی والدن منطرح جسماً بلا روح

تھوڑی تھوڑی کر کے میں مشکیزہ کی روح آہستہ آہستہ نکالتا رہا اور اس کے مجروح جوف سے اس کا خون پیتا رہا۔

یہاں تک میں جب ہٹا تو میرے جسم میں دو رو میں بقیں اور مشکیزہ کا جسم روح پڑا ہوا تھا۔

ایک جگہ شراب کے نشہ میں چور شخص کا ذکر ابونواس ان الفاظ میں کرتا ہے:-

ومستطیل علی الصہباء باکدھا فی فتیۃ باصطباح الرقاق حذاق

فکل شئ سراً ظنہ قدھا وکل شخص سراً ظنہ الساقی

صوبھی پی کر ایک شخص چت پڑا ہے۔ یہ صوبھی اس نے ان نوجوانوں کے ساتھ پی ہے جو صبح کے وقت شراب نوشی میں بڑے ماہر ہیں۔

اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے ہر چیز جام اور ہر شخص ساقی نظر آتا ہے۔

ایک اور جگہ کہتا ہے:-

مالذۃ العیش الا شرب صافیۃ فی بیت خماسۃ او ظل بستان

زندگی کی لذت تو اس میں ہے کہ کسی شراب پیچنے والی کے گھر میں یا کسی باغ کے سایہ میں شراب صافی پی جائے۔

(۶) پردہ اور فطری حیاتی وجہ سے عورت تک رسائی میں دشواری ہوتی ہے اس لئے ایرانی تہذیب کے زیر اثر کچ فطرت لوگ ان

امردوں کے جانب مائل ہو جاتے ہیں جو بقائے عمر مردانگی کے مقابلہ میں نسوانیت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ عباسی دور میں تقریباً

ہر شاعر کسی نہ کسی لڑکے کی محبت میں گرفتار نظر آتا ہے اور چونکہ یہ دور بڑی حد تک زبان اور قلم کی آزادی کا دور ہے اس لئے لڑکوں سے اپنے

عشق کو بغیر کسی باک کے اپنے اشعار میں ذکر کرتا ہے۔ شراب کی طرح ابونواس اس "غزل مذکر" میں بھی تمام شعراء کا امام ہے۔ اس کے دیوان میں

لڑکوں کے وصف میں "غزل مذکر" کے نام سے ایک مستقل باب ہے جو تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

ایک جگہ وہ کہتا ہے:-

غنیت عن الکواعب بالغلام وعن شراب المروق بالمدام

لڑکے کے ہوتے، میں دوشیزہ عورتوں سے بے نیاز ہوں اور عام شراب کے ہوتے مجھے نفعی ہوئی شراب کی ضرورت نہیں۔

کمن القاہ فی سرو جھر واطمع منه فی سدا السلام

مجھے تو (پردہ نشینوں کی بہ نسبت) وہ معشوق زیادہ پسند ہے جس سے میں پوشیدہ طور پر بھی مل سکتا ہوں اور کھل کر بھی اور اس سے

سلام کے جواب کی توقع بھی رکھ سکتا ہوں۔

اکلمہ بما اھوی صریحاً بلا خوف الموزن والامام

میں اس سے جو چاہوں موزن و امام کے خوف کے بغیر کھل کر کہہ سکتا ہوں۔

(۷) اس دور میں اسباب ہو کی کثرت ہے۔ شراب، لونڈیاں، غلمان اور سرود عام ہے۔ ان چیزوں کے ہوتے، ان لوگوں میں

۱۔ اس شعر کا تعلق اس سے پہلے کے شعر سے ہے جس کا عریانیت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔

جوان چیزوں میں گھرے ہوئے ہوں، اسلام کی اخلاقی اقدار کا بقا ممکن نہیں، چنانچہ اس دور کی شاعری جاہلی اور اموی دور کی شاعری کے مقابلہ میں عربیاتی، رکاکت اور بے حیائی کی حامل ہے۔ شراب اور غزل مذکر کی طرح ابونہیں نکلتے دبیانی کا بھی امام ہے۔ اس کے دیوان میں ایک باب کا عنوان ہے "النخمر والمجون" اور ایک باب کا عنوان صرف "المجون" ہے۔ مؤخر الذکر باب بعض انتہائی عربیائیوں کی وجہ سے بعض اشاعتوں سے حذف بھی کر دیا گیا ہے۔

ابونواس کی کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف خود گناہوں کی کثرت کا شکار ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے اور اس کی یہ تلقین مذہبی فلسفہ کا لباس پہنکر شاعرانہ اسلوب میں اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ :-

تكثر ما استطعت من الخطايا فانك بالغ سر باغفوراً

جتنے ہو سکیں زیادہ سے زیادہ گناہ کرو اس لئے کہ تمہیں اس پروردگار کے پاس پہنچنا ہے جو بہت مغفرت فرمانے والا ہے۔

ستبصراں و سادت علیہ عفواً وتلقى سید المکا کبیراً

اگر اسکے سامنے تمہاری پیشی ہوئی تو تم یقیناً اس کا عفو و درگزر دیکھو گے اور تمہیں ایسی ہستی سے پالا پڑے گا جو سب کی سردار اور بڑی ہستی ہے۔

تعفن ندامة كفيك ممّا تركت مخافة التار السورل

دوزخ کے خوف سے تم نے جن لذتوں کو یہاں چھوڑ دیا وہاں ان پر پچھتاتے ہوئے دانتوں میں انگلی دو گے۔

مذکورہ سطور میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان خصوصیات کے پیدا ہو جانے کے متعدد اسباب و وجوہ ہیں جن میں سے بعض کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ عباسی دور کا شاعر درباری شاعر اور خلفہ کا ندیم و مصاحب ہوتا تھا۔ اموی خلفاء کو امور سلطنت خود انجام دینے پڑتے تھے۔ ان کے دور میں وزارت کا کوئی عہدہ نہ تھا۔ اسی لئے عدیم الفرستی کی وجہ سے ان کے دربار میں کسی شاعر کو اگر بار ملتا تھا تو صرف خصوصی مواقع پر۔ لیکن عباسی خلافت کے دور میں وزارت کا عہدہ قائم ہو چکا تھا۔ سلطنت کے تمام امور علی طور پر وزیر انجام دیتا تھا اور خلیفہ صرف نگران ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفاء کو فرصت زیادہ نصیب ہوئی۔ چنانچہ شعراء کو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ جلوت و قنوت کی اس ہم نشینی کی وجہ سے شاعر، شاعر کم رہ گیا اور بھانڈا زیادہ ہو گیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ ہر وقت خلیفہ کو خوش کرنے کی فکر میں رہے۔ خلفاء کا مذاق انتہائی پست ہو گیا تھا۔ ان کی جلوبتیں خواہ کیسی بھی ہوں، ان کی قلوبتیں یقیناً عیاشیوں کا مرقع تھیں (الامام اشار اللہ)۔ اسی لئے اس دور کی شاعری ایک طرف فکر و تخیل کے ارتقاء کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف رنگینی سے معمور اور بدستی سے داغدار بھی ہے۔

نظریہ منبہر

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعراء کا فرق۔ معاصرین کی رائیں۔ مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت - تین روپے

نگار پاکستان سکا رڈن مارکیٹ - کراچی

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی

حیف نقوی

منشی انوار حسین تسلیم کا نام ایسے لوگوں کے لئے یقیناً نیا نہیں جنہیں اردو ادب کے قدیم سرمائے سے دلچسپی رہی ہے۔ اور جنہوں نے نول کشور پریس کے عہد شباب کی مطبوعات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطبع سے چھپ کر نکلی ہوئی بیشتر کتابوں کے آخر میں آپ کی تقریظیں اور تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ منشی صاحب نسباً شیخ صدیقی تھے اور سہسوان کے ایک معزز اور ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی ولادت ۲۱ رجب ۱۲۳۵ھ مطابق (۱۸۱۵ء) کو دکن ہی میں ہوئی تھی۔ وہیں آپ نے تربیت و تعلیم کے تمام مراحل طے کئے اور فارسی زبان و ادب نیز دیگر علوم متداولہ میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کے عم حقیقی منشی قیام الدین صاحب کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے کسب معاش کی غرض سے مراد آباد کا رخ کیا۔ جہاں آپ کے چچا کو توال شہر کی حیثیت سے ملازم تھے اور آپ کے والد منشی احتشام الدین محمد صاحب ایک مدت سے دکالت کر رہے تھے۔ وہاں عدالت دیوانی میں بعدہ امانت آپ کا تقرر ہو گیا۔ دوران ملازمت میں ابتداءً بھول رخصت وطن میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم رہا لیکن ۱۸۴۵ء میں والد کے انتقال کے بعد مراد آباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اوائل ۱۸۵۸ء میں سیاسی نوعیت کے بعض الزامات کی بنیاد پر آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اس کے بعد تقریباً تین چار سال کی مدت سہسوان میں گزار کر ۱۸۶۲ء کے اواخر یا ۱۸۶۳ء کی ابتداء میں لکھنؤ پہنچے اور ”ادھ اخبار“ سے وابستہ ہو گئے یہ تعلق یکم مارچ ۱۸۶۹ء تک قائم رہا۔ دراصل یہی ملازمت علمی و ادبی دنیا میں آپ کے تعارف اور شہرت کا باعث بنی چنانچہ اخبار مذکور کے متعلق اپنے ایک مضمون میں اس احسان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

”اسی اجلہ نے بندہ کو مشہور نزدیک و دور کیا ہے۔ میرا بڑا محسن“

”ادھ اخبار“ سے قطع تعلق کے بعد غالباً جنوری ۱۸۸۱ء میں منشی صاحب اپنے عزیز شاگرد راجہ کشن کمار صاحب دقار کی دعوت پر دوبارہ مراد آباد پہنچے۔ آپ کی یہ مراجعت وہاں کے ادبی و صحافتی حلقوں کے لئے کس قدر مسرت انگیز ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اخبار ”نیر اعظم“ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۸۱ء کی درج ذیل خبر سے لگایا جاسکتا ہے:-

”شاعر لاثانی منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی نے آج ہمارے مطبع کو اپنے قدم سے شرف بخشا۔ مہتمم کو سر بلند کیا۔ منشی صاحب ہمارے قدیم مخدوم نہیں۔ بعد سولہ سال کے

۱۵ اخبار نیر اعظم مراد آباد مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۸۱ء

۱۶ یہ دونوں خطوط ماہنامہ خیاباں لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکے ہیں

۱۷ تسلیم صفحہ ۸۲

۱۸ ایضاً نیر اعظم مورخہ ۱۸ جنوری ۱۸۸۱ء

مراد آباد کا نصیب آپ کی تشریف آوری سے جاگتا ہے یقین ہے کہ سکونت دائمی مراد آباد کی اختیار فرمائیں گے۔

نسیم کے احباب و تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ملک کے بیشتر اربابِ فضل و کمال سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان لوگوں میں آن جہانی منشی نول کشور اور راجہ کشن کمار دقار رئیس مراد آباد کے نام سرفہرست ہیں۔ منشی صاحب موصوف علم فضل کے ساتھ ساتھ نازک مزاجی میں بھی یکتائے عصر تھے اپنی طبیعت کی اس افتاد پر انھوں نے ایک شعر میں خود بھی روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں کہ

نازک مزاج مجھ سا ہوا ہے نہ ہوئے گا روح سبک بھی اپنی ہے بارگراں مجھے

لیکن آپ کے یہ دونوں قدرداں ان نازک مزاجیوں کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور آپ کی قدر و منزلت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ منشی صاحب کو کبھی کبھی ان لوگوں سے علیحدہ رہنا گوارا نہ ہوا اور وطن اور اعزہ سے قطع تعلق کے بعد انھوں نے غیروں سے محبت دیکھا نگت کا جو رشتہ قائم کیا تھا وہ تادم آخر برقرار رہا۔

مولانا امام بخش صہبائی، مرزا رجب علی بیگ سردار، مظفر علی خاں اسیر، منشی امیر اللہ تسلیم۔ نواب مرزا خاں داغ اور امیر مینائی سے ان کے بہت گہرے اور پر خلوص مراسم تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کے خطوط جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اس ربطِ باہمی کی یادگار ہیں۔ مولانا صہبائی کا ایک خط جس میں فن تاریخ گوئی سے متعلق ایک اہم مسئلے پر بحث کی گئی ہے "ملخص تسلیم" میں شامل ہے۔ آئندہ سطور میں امیر مینائی کا ایک خط ملاحظہ سے گزرے گا سطور ذیل میں منشی صاحب کا ایک خط موصوفہ مرزا رجب علی بیگ سردار مع جواب کے نقل کیا جاتا ہے تاکہ تعلقات کی اس نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

خط من جانب منشی انوار حسین نسیم سہسوانی

"ساتی بے پردا" مست بادہ استغفار، غافل از حال مردم نزدیک دور مرزا رجب علی بیگ سردار جس دن سے بندہ کانپور میں مقیم ہے، پریشانی کے ہاتھوں حالِ جمعیت سقیم ہے۔ کام کی کثرت سے امور ذاتی میں تسو فتور، فرصت کی قلت سے معاملہ صفاتی میں ہزار قصور۔ یا رشکوہ طراز ہیں۔ اغیار سخن پرداز۔ خفقان کا جوش ہے، مراق کا خروش۔ بیدلی دلولہ کوش ہے۔ بیکسی جلوہ فردش، ہر دم کلفتِ خاطر زیادہ، وحشت لے اڑنے پر آمادہ اس کیفیت پر کبھی صبر نہ آیا، مصرعِ طرح عنایت فرمایا۔ انصاف شرط، تمہیں فرماؤ۔ ادھر دیکھو، آنکھیں نہ چراؤ۔ یہ دوستی کا انداز ہے یا دشمنی کا ساز ہے۔ بہر تقدیر تمہیں حکم بجالاتا ہوں۔ چند نالہ دل خراش سناتا ہوں۔ قصباتی ہوں ہاتی ہوں، لٹھ زبان ہے۔ سخت بیان ہے۔ اب مردت کا انضباط کیجئے۔ چوپ نا تراشیدہ کو خراط کیجئے دستِ دھلم کو تکلیف دیجئے اور بندگی کا سر خط لیجئے۔ اعراض پر اعتراض فرمائے اور اعتراض پر اعراض لائیے۔ بعد ملاحظہ و اصلاح کے بجنسہ ہی کاغذ..... فرمائیے اور بندہ کو قید انتظار سے چھوڑائیے فقط۔

ششم فروری ۱۸۶۵ء

المکلف محمد انوار حسین نسیم

جواب از جانب مرزا رجب علی بیگ سردار

”سبحان اللہ شیر بیشہ فصاحت ہو، ہر بر میدان بلاغت ہو۔ کیا مجال ہے کسی کی جو تمھارے سامنے رو بہ بازی کر سکے۔ نظم میں لاثانی ہو۔ نثر کے بانی ہو۔ بے مثل ہو یکتا ہو۔ زبان لڑکھڑاتی ہے کیا کہوں کہ کیا ہو، چھپے رستم ہو، منشی صاحب کے رفیق دہمدم ہو۔ والسلام رقیہ تمام ہوا۔

بندہ بھی اگرچہ نزدیک نہیں دور ہے مگر منشی نول کشور صاحب کی عنایت سے مسرور ہے، مسرور ہے۔“

تسلیم ایک جامع الکمال شخصیت کے مالک تھے۔ فارسی وارد و نظم و نثر پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ مشغلہ نثر و نظم فارسی تو خاندانی ورثہ تھا جو انھیں اپنے دادا منشی ریاض شاگرد مرزا منظر جانجاں سے بواسطہ منشی قیام الدین بقیہ حاصل ہوا تھا۔ لیکن ریختہ گوئی میں بھی وہ اپنے ہم عصر اساتذہ سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ یہ منزل انھوں نے مصحفی کے مشہور شاگرد شیخ علی بخش بیمار کی رہنمائی میں طے کی تھی۔ عمر کے تقریباً پینسٹھ چھیانوے سال شعر و ادب کی خدمت میں صرف کرنے کی بنا پر ان کے قلم سے کافی نثری و شعری سرمایہ معرض وجود میں آیا لیکن افسوس کہ اس متاع بے بہا کا بیشتر حصہ خود انھیں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ بربادی اپنی تصانیف کو تکمیل کے بعد نذر آتش کرتے رہنے کی مستقل عادت کا نتیجہ تھی۔ نواب کلب علی خاں فرمانروائے رام پور کے نام ایک عرضی میں سرمایہ فکر و فن کی اس غارت گری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

”اس بدراج خرد دشمن نے لکھنؤ میں ۲۵ اگست ۱۸۷۵ء کو چار سو باسٹھ جز نظم و نثر اردو فارسی اپنی تصنیف و تالیف کی جلادی۔ بار دیگر یکم ستمبر ۱۸۷۶ء کو بہ مقام مراد آباد دو لہستہ پھونک دئے جن میں مسودات کے سوا یہ کتابیں مرتب و مکمل تھیں..... منوئی اردو نو ہزار بیت کی، دیوان فارسی متن و حاشیہ بنیس جز، دیوان اردو متن و حاشیہ پچاس جز، رسالہ قواعد تاریک گوئی انیس جز.....“

اخبار نیر اعظم مراد آباد مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۷۶ء میں ایک خاص مضمون کے تحت رقمطراز ہیں کہ:-

”دوبارہ اجائے نظم و نثر تالیف خود را کہ ز انداز شش صد جز بود پیرا ہن شعلہ آتش ساختہ ام و بعد اں کہ بحکم شغل بیکاری جمع شدہ، تفصیل آں ایں است:-

(۱) رسالہ در فن تاریک گوئی ۱۹ جز (۲) خواب اردو پنج جز (۳) دیوان فارسی شش جز متن و حاشیہ

۱۔ یہ عرضی جس کا مقصد ایک غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ امیر مینائی کی معرفت نواب صاحب کو بھیجی گئی تھی۔ ساتھ ہی امیر کے نام ایک خط بھی تھا جس کا جواب مع اس عرضی کے مکمل متن کے اخبار تہذیب مراد آباد مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ جوابی مکتوب تسلیم اور امیر کے باہمی تعلقات اور ایک کی نظر میں دوسرے کے وقار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لئے اس کا بیاں نقل کر دینا۔ یقیناً بے محل نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔

حضرت تسلیم کی خدمت میں بعد تسلیم التماس ہے کہ ملامت نامہ آیا۔ شکر گزار فرمایا ہے ہرچہ از دست می رسد نیکو ست۔ اپنی بے جرمی کی کیفیت اور اس امر کا ہی افواہی سے اطلاع نہ دینے کی علت اور کسی وقت پر موقوف۔ اصل مطلب سنئے کہ عرضی شدت انتظار میں پہنچی۔ میں اگرچہ بیمار تھا اور درویشانہ بازو و پشت میں بیقرار تھا مگر کسی وقت دوبار گیا اور حضور میں اس کو پیش کیا۔ بعد ملاحظہ جو کچھ زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوا حاصل اس کا یہ ہے کہ پہلے بھی انتساب کا یقین نہ تھا۔ اور اب تو وہم بھی نہ رہا۔ مگر با رنجوری درد مندی کے عذر سے یہ خراعت نامہ مختصر دربار سے اٹھ کر لکھ بھیجا تاکہ خاطر خاطر سے نگرانی جائے۔ نیاز مند کو آپ اپنا خیر اندیش خاص تصور فرمائیں اور ہمارا کسی موقع پر کمی اور پہلو ہوتی کرنے کا احتمال دل میں نہ لائیں۔ فقط

راحم ماسم امیر فقیر

(۳) دیوان اردو، شانزدہ جز متن و حاشیہ، (۵) رسالہ خال ہفت صد سوال معہ جواب سنجیدہ جز، (۶) شنوی اردو، دہ ہزار و شمش صد و شصت و یک بیت، بست و ہفت جز (۷) نظم و نثر فارسی و اردو، ہفتاد و یک جز (۸) بہار ہند، مصطلحات اردو یکصد و سی جز (۹) کتاب در قواعد نظم و نثر فارسی، ہفتہ جز۔ سہ کتاب چوں جاں در قالب طبع در آمدہ اند۔ نمبر ۱۔ شنوی سعدین اردو۔ نمبر ۲۔ تاج المآثر فارسی نظم و نثر در مدرج دالی رامپور۔ نمبر ۳۔ مثنوی در محاسن و طلیہ بھوپال۔

یہ تمام غیر مطبوعہ کتابیں جن کا ذکر پوری تفصیلات کے ساتھ اس عبارت میں آیا ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء کے بعد سے اپریل ۱۹۸۴ء تک کی کوشش فکر اور ذوق نگارش کا نتیجہ تھیں۔ پانچ ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں مختلف موضوعات نثر و نظم پر اس قدر مواد کا جمع ہوا کہ مصنف کی قادر الکلامی اور تالیفی و تصنیفی مشاغل میں غیر معمولی اہٹاک کی ایک واضح دلیل ہے۔ لیکن اس تمام ذخیرے کا کیا انجام ہوا۔ اس سلسلے میں تسلیم کی کسی تحریر سے کوئی شہادت نہیں ملتی گمان غالب یہ ہے کہ حسب روایات سابقہ اسے بھی نذر آتش کر دیا گیا ہو گا۔ نواب شمشیر بہادر اختر رئیس اچھے گڑھ کے مندرجہ ذیل بیان سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔ موصوف ایڈیٹر ماہنامہ مخزن دہلی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔

”میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ منشی انوار حسین صاحب مرحوم تسلیم ہسوانی نے دو صندوق کتابوں بھرے ہوئے جو کہ خاص انھیں کی تصانیف و تالیفات تھیں جلا کر خاک کر دیے۔ ان میں سے بعض بعض کتاب ایسی بے مثل و لا جواب تھیں کہ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ایک تو صرف دعو کی اور دد لغت کی۔ اگر یہ شائع ہو جاتیں تو ملک کو بہت فائدہ پہنچاتیں۔ میں نے اور پنڈت بنواری لعل نے پوچھا تھا کہ منشی صاحب ایسا کس واسطہ کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے ارے بھائی اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں گا جو انھیں شائع کروں“

اس خط میں لغت اور صرف دعو سے متعلق جن کتابوں کا ذکر آیا ہے۔ جلائی جانے والی تصانیف کی فہرست میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ البتہ آخری فہرست میں بہار ہند کے نام سے اس قسم کی ایک کتاب شامل ہے۔ اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ جناب اختر نے جو کتابیں اپنی آنکھوں سے جلتے ہوئے دیکھی تھیں۔ ان میں موخر الذکر تصانیف بھی شامل رہی ہوں گی لیکن چونکہ یہ امر بھی بعید از امکان نہیں کہ اس واقعے کا تعلق ۲۵ اگست ۱۹۴۵ء کو نذر آتش کی جانے والی تصنیفات سے ہو۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مناسب نہ ہو گا۔

زود گوئی | تسلیم نہایت مشاق اور زرد گو شاعر تھے۔ شعر کہنا ان کی زندگی کا ایک معمول بن گیا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ شاعری ان کی زندگی تھی اور زندگی شاعری۔ ایام ضعیفی کی ایک تحریر میں وہ خود اپنی اس مہارت فن اور قدرت کلام کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

یاد آں روز کہ زرد بر نامہ نازش می داشت و بسیار گوئی بسر طبعم سو گندمی خورد در خاک و خوں می تپاند
اور منذ حبزیل واقعہ سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ

”راے کشن کمار صاحب دقار نے منشی انوار حسین صاحب تسلیم ہسوانی کو جو ان کے استاد ہیں، لکھنؤ سے بخلوص عقیدت بنا بر استفادہ بلوایا۔ ایک دن بوقت شام کہ در تقریر ہر طرف سے داکھا۔“

رائے صاحب نے فرمایا کہ - آپ نے فارسی کہنا بالکل ترک کر دیا - اسی شب حضرت تسلیم نے اکٹھ بیت فارسی میں فرما کر صبح کو پیش کیں

تاریخ گوئی | تاریخ گوئی میں تسلیم کو خاص کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنا زیادہ تر زور فکر و قلم اسی فن پر صرف کیا ہے۔ اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کچھ دودھیوں میں ہندوستان کی سرزمین سے ان جیسا ماہر و مشاق تاریخ گو پیدا نہیں ہوا۔ جناب کسری منہاس کے بقول: "اس خاص جوہر کی وجہ سے ان کا نام دنیا نے ادب میں آج تک زندہ ہے اور ہر دور کا مورخ ان کے کارناموں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے"۔ ملخص تسلیم اس موضوع پر آپ کی عدیم المثال اور جامع و مبسوط تصنیف ہے۔ یہ کتاب جو آپ کی گہری واقفیت اور زندگی بھر کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں فن تاریخ گوئی اور اس کے اصول و مبادیات سے بحث کی گئی ہے اور متنازعہ مسائل کو فاضلانہ اور عالمانہ طور پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مصنف کے طبع زاد اختراعات و ایجادات پر مشتمل ہے۔ منشی صاحب کا دعوئے یہ ہے کہ -

"درفن تاریخ گوئی (دینر در نظم و نثر) بسیار قاعدہ مستخرجہ طبع من است۔ ممکن نیست کہ در بطلان و عدیم مدعی کتابے در سند آرد"

لالہ سری رام نے منشی صاحب کے ذکر میں ان کے اس کمال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ -
"تاریخ گوئی میں ایسا کلام رکھتے تھے کہ ان کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی صنائع و بدائع سے آپ کی تاریخیں مملو ہوتی ہیں"

شاعری | ہر معرکے میں کھلتے ہیں جوہر کمال کے مانند شیخ تیر علی ہے زباں مجھے
تسلیم کی عظیم شخصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کے فارسی وارد و کلام کا جامع اور مفصل جائزہ لیا جاتا لیکن جیسا کہ سابقہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ دوسری تصانیف کے ساتھ خود انھیں کے ہاتھوں ضائع ہو چکا۔ اور فارسی وارد کی دو مطبوعہ شذویات تاج الکلام دسعدین کے علاوہ جو کرم خوردہ دہ سیدہ مسودات اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کا پڑھنا دشوار ہے۔ ایسی صورت میں جس قدر اشعار پڑھے جاسکے ہیں یا تذکروں وغیرہ میں منقول ہیں۔ ان کا انتخاب اجمالی تبصرہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

فارسی کلام | منشی صاحب کو فارسی زبان اور اس کے شعر و ادب پر زبردست عبور حاصل تھا۔ اگرچہ انھوں نے شذوی اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی طبیعت غزل کی طرف زیادہ مائل تھی۔ فارسی غزل کے نقوش ان کے دل و دماغ پر زیادہ تھے اور اس کی روایات اچھی طرح ان کے شعور میں رچی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام کا معیار اردو کے مقابلے میں بلند تر ہے۔ ان کے یہاں اس مختصر سرمایہ فکر میں بھی جو راقم الحروف کو دستیاب ہو سکا ہے، مضمون آفرینی، جدت خیال اور ندرت بیان کے بعض اچھے نمونے موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ نادر تشبیہات اور لطیف و بلیغ استعارات کی بھی کمی نہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے -

سازد برگ من بوہا ز حادثات روزگار برق سوزاں رشتہ شمع شبستان من است

۱۔ اخبار نیر اعظم، مورخہ ۱۹۸۱ء - ۲۔ نقوش لاہور شمارہ جون ۱۹۶۶ء مقالہ بعنوان "تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل"۔ ملخص تسلیم کی روشنی میں - ۳۔ اخبار نیر اعظم، مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۱ء - ۴۔ خزانہ جاوید جلد دوم ص ۷۷

ایک موقع پر اپنا اور اپنے محبوب کا تقابلی خاکہ بڑے لطیف انداز میں کھینچا ہے ۔
 آن منم یاد نیایم بدل دشمن دودست تو نہ آئی کہ شوی لحظہ فراموش کسے
 مندرجہ ذیل شعر میں بداعت خیال کے پہلو پہ پہلو چشم تنگ ظن "د" نگہ جاں شکار جیسی ترکیب کی شگفتگی اور ندرت کمال دیکھئے
 اے مرگ مرزہ باد کہ آن چشم تنگ ظن فرصت نمی دہد نگہ جاں شکار را
 چند فارسی اشعار اور ملاحظہ کیجئے ۔
 باشد شعار گردوں دلہائے خستہ ختن آموختہ است کافر مضمون لبثہ لبثن

از تباں ناز و عتاب و عشوہ میا خوش است بندگی و عجز تسلیم دنیا ز ازا خوش است
 دید از ہر چوں بسوئے روئے آن مہیارہ گفت چاک ہا اندر کتانِ پاکی و تھوئی خوش است

بوسہ از یار تمنّا کردم طلب قطرہ ز دریا کردم
 بیوفائی ہمہ خواباں دارند شکوہ ات کردم دیجا کردم
 مست بودم بہ خیال ساقی دہمت در گردن مینا کردم

قربان شیوہ توئی رنجم اے صنم دیگر فریب دہ دل امید دار را

طرح تعمیر دلم لغز بس خراب افتادہ است قطرہ در آتش داغ در آب افتادہ است

قسمت نقطہ موہوم کہ دید کہ شنید می طہ خندہ عبث برب خاموش کسے
 لذت بوسہ بہ پیغام علاج دل ماست سخن تلخ لبس است از لب خاموش کسے
 مرزہ وصل کجا دل افسردہ کجا ایں تنگ شیشہ دآں بادہ سر جوش کسے
 کار با سوختن افتاد مرا اے تسلیم آتش ز دہ دلم شعلہ خپوش کسے

تسلیم کی اردو شاعری جس زمانے سے تعلق رکھتی ہے وہ ہماری قومی دادی تاریخ کا انقلابی دور خیال کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے دور ہے پر کھڑے تھے جہاں دو مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم تھیں اور اس تصادم کے اثرات ہر شعبہ حیات کو تیزی سے اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ شاعری کی دنیا میں بھی ایک طرت دبستانِ دہلی کی قدیم روایات اور دوسری جانب اساتذہ لکھنؤ کے اجتہادات تھے۔ اور ان دونوں مکتبہ ہائے خیال کی سختی کے ساتھ پیردی کرنے والے گردہوں کے درمیان اختلاف و کشمکش کا سلسلہ طول کھینچتا جا رہا تھا۔ تسلیم نے ان حالات میں توازن و اعتدال کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کا دامن فکر پڑی حد تک انتہا پسندی کے بدناما داغ سے پاک نظر آتا ہے۔ ان کا کلام رنگارنگ ہے۔ اس میں غالب کی ہی مضمون آفرینی اور بلند خیالی بھی ہے اور ماحول کے تقاضوں کے عین مطابق تکلف و تصنع کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ غالب کے رنگ میں ایک غزل

اردو کلام

کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بھراکتش سوز سے سینے میں لہریاں ہیں
اشک کا ہر ایک قطرہ پارہ سیماب ہے
روئے آتشاک کا کس کے پڑپانی میں عکس
شعلہ جوالہ ہے جو حلقہ گرداب ہے
مزدہ لے لومیدی جادید بھر حسرت رہی
ہاتھ میں اس ترک کے پھر خنجر بے آب ہے
میرے دیرانے میں کس کے حسن نے باندھا م
ذرہ ناچیز رشک مہر عالم تاب ہے
لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے یہاں لکھنویت کو عنصر غالب کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ بعض جگہ الفاظ کے
رکھ رکھاؤ اور لفظی ینا کاری و صناعتی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار بطور خاص ملاحظہ طلب ہیں ۔

داں گاہ گاہ یاں گہ و بیگاہ ہے تڑپ
نسبت ہے مجھ سے برق کو کیا اضطراب میں

کرتی تھی شمع ساقِ صنم سے مقابلہ
جلتی ہے محفلوں میں یہ اس کا مال ہے

پشتِ پاگوما و تابان کی نہ لگ جائے نظر
چٹکیوں سے پانچے اے آفتِ جاں چھوڑے
لکھنؤ رنگ سخن کے دیگر مقلدین کی طرح تسلیم کے یہاں بھی ایسی چٹکاریاں بہت کم ملتی ہیں جو پڑھنے والوں کے احساس میں گرمی
پیدا کر دیں اور ان کے سینے میں اپنے دل کی دھڑکنیں سن سکیں۔ البتہ عام شاعروں کے برخلاف انھوں نے تصوف کے سہارے
کہیں کہیں اس کی تلافی کر دی ہے۔ ان کے مقصودانہ اشعار میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ مثلاً ۔

دیر و حرم میں بیٹھنے دیتا نہیں کوئی
اتھ کر تمھارے در سے کہیں کا نہیں لایا
مایوسی جادید کے صدمے نہیں اٹھتے
میں کاش ترا محرم اسرار نہ ہوتا
اوراق گلوں کے ہیں پریشاں چمن میں
غنچوں سے چھپایا نہ گیا راز تبسم
اس مختصر تبصرے کے ساتھ مختلف مطبوعہ و غیر مطبوعہ غزلوں کا ایک انتخاب ہدیہ ناظرین ہے جس سے تسلیم کے کلام کی مجموعی کیفیت
اور عام رنگ و آہنگ کا اندازہ ہوگا ۔

انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ

زاہد جو ترا نکتہ توحید سمجھتا
سجدے سے بتوں کے اسے انکار نہ ہوتا

پھر بہار آئی چمن میں، پھر کھلے داغِ جگر
جو ہر دیوانگی حیرت میں دکھلائے لگا
پھر جنوں چمکا مرا سر سبز صحرا دیکھ کر
وہ پری رو آئینے میں اپنا جلوہ دیکھ کر

ٹوٹا ہی نہیں اس جان جہاں کا پردہ
وہ نہ آئے، جو شب بھر جیسا ہوتا میں
بے مروت نے نکالا ہے کہاں کا پردہ
رکھ لیا موت نے تاثیرِ فغاں کا پردہ

لکھننگ کی صرصر نے اڑائی یہ خاک
اظہار وفا سے فائدہ کیا
کہ ہوا فاش ترے سوختہ جاں کا پردہ
میں آپ کو خوب جانتا ہوں

ٹوٹ جاتا ہے کبھی اور کبھی بھرتا ہے
ساقیا خیر تری، میکدہ آباد رہے
دل پر درہے سینے میں کہ چھالا کوئی
اور بھی دے دے گلگوں کا پیالا کوئی

دوستی دشمنوں کی کھل جاتی
آپ اگر میرا امتحاں کرتے

لستر میں نہ یا سمن میں ہے
حال یہ ان کی انجمن میں ہے
جو لطافت ترے بدن میں ہے
ہر سخن معرض سخن میں ہے
کی صبا نے مگر زلیخا کی
چاک ہر گل کے پیرہن میں ہے

چمکا ہے رنگ عارض جاناں شراب سے
مہتاب کو فردغ ہوا آفتاب سے

انتخاب غزلیات مطبوعہ

دیکھا جو سحر یار کا انداز تبسم
اعجاز نے عیسیٰ کے کیا مردوں کو زندہ
گر پڑ کے ہوئی برق بھی دسا تبسم
عیسیٰ کو جلاتا ہے وہ اعجاز تبسم
رنگ اپنا جمانا ہے جو تسلیم گلوں کو
زخموں سے مرے سیکھ لیں انداز تبسم

مانند ابراشک سے دامن بھگوئیں کیوں
ہوتی ہے گزشتہ اثر آہ سے انھیں
اک بوند آبرو دے لے ہم دلوں کیوں
دل میں کسی کے نشتر مرگاں چھوئیں کیوں
تسلیم ہو رہے گا جو ہونا ہے حشر میں
ہم آج آنکھیں خون سے رور کے کھوئیں کیوں

رنگ جھنے کا نہیں تسلیم اس گلزار میں
ہم صغیروں سے مراطر زبیاں متا نہیں

شکر خدا کہ ہجر میں صورت بدل گئی
کرتے ہیں یاد دہ کہ اجل نے کیا ہے یاد
آئے ہیں وہ سنا نے مری داستاں مجھے
آتی ہیں آج ہچکیوں پر چکیاں مجھے

غزلیات کے علاوہ تسلیم کے قلمی مسودات میں ایک مستقل تصنیف "سراپائے سخن" کے کچھ منتشر ادراک اور چند سلام بھی ملے ہیں "سراپائے سخن" میں جسم انسانی کے مختلف اعضا، کو مرکز فکر بنا کر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں صرف وہ

سلام

غزلیں شامل ہیں جن کی ردیفوں کے لئے اعضائے جسمانی کے نام مثلاً سر، ہاتھ، رخ، چشم، لب، زلف، گیسو، پاک، خط، عارض وغیرہ انتخاب کئے گئے ہیں۔

تسلیم کے سلاموں کی بنیاد انھیں روایات پر استوار ہوئی ہے جو دوسرے مشاہیر شعراء کے سلاموں میں عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تسلیم مذہباً سنی تھے۔ اس لئے ان کے یہاں اس بے پناہ عقیدت مندی اور بے کراں جذباتیت کی تلاش بے سود ہے جو انیس وغیرہ کے کلام میں نظر آتی ہے لیکن خلوص، سوز و گداز، اور غمگینی و تاثیر کے اعتبار سے ان کے یہ سلام ہر طرح مکمل ہیں۔ اس دعوے کی تائید میں یہ اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔

نشاں ملے گا نہ ہرگز نہ کفن اپنا	غم حسین میں لاغر ہوا یہ تن اپنا
نہ گل کو یا د ہو بھولے سے بھی چمن اپنا	بہار، سینہ پردارغ کی، اگر دیکھے
ہزار حیف کہ دیکھا نہ پھر چمن اپنا	مثالی نگہ ت گل ہو گئے پریشاں سب
بنی نے سایہ کیا جس پہ پیر ہن اپنا	ہے یہ دھوپ کے صدمے وہ گل قیامت
کہ حافظ اب وہی رب ذوالمنن اپنا	یہ کہہ کے شاہ روانہ ہوئے سوئے میلان
اسی کی نذر کیا ہم نے یہ چمن اپنا	کیا خلیل پہ آتش کو نکلتا جس نے

جب ایسے شاہ کو غربت نصیب ہو تسلیم

کردن نہ ترک میں کس طرح پھر وطن اپنا

دہ دل بھی تجلی میں نہیں طور سے کم ہے	جس دل میں محبت ہے حسین ابن علی کی
اس بار سے پشتِ فلک پیر بھی خم ہے	کیوں کر نہ کمر خم ہو غم نشہ میں ہماری
پیا سے پہ کئی دن کے الہی یہ ستم ہے	زہر لے کہا دیکھ کے حالِ شہ کو نین
منزل ہے کڑی پادِ نپہ عابد کے دم ہے	ہر دم یہ صدا آتی تھی زنجیر کے غل سے

تسلیم وہی حشر میں دلشاد اٹھے گا

دنیا میں حسین ابن علی کا جسے غم ہے

خدا انکسیر

کی چند کاپیاں رہ گئی ہیں۔ جن حضرات کو یہ نمبر درکار ہو جلد مطلع فرمائیں۔

مینچر۔ نگار پاکستان۔ ۴۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی۔

قربانی، شرعی و عقلی نقطہ نظر سے

زیب النساء بیگم

اس مقالہ کا موضوع بڑا اہم ہے اور زیادہ وسعت و عمق کے ساتھ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، مذہبی و تمدنی دونوں حیثیتوں سے — محترمہ زیب النساء بیگم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت تشنه و ناقص ہے لیکن میں اسے شائع کر رہا ہوں صرف اس لیے کہ اس مضمون کے شائع کرنے سے اکثر رسائل نے انکار کر دیا تھا۔ جو صحافی و علمی دونوں حیثیتوں سے قابل اعتراض بات ہے۔

قربانی کی عمومیت کو میں بھی پسند نہیں کرتا اور اس کی مذہبی اہمیت بھی میسر نزدیک محل نظر ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ آئندہ کسی اشاعت میں اس پر تفصیلی گفتگو کروں۔

(نیا نر)

نام ہے ایک رسالہ کا جس میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قربانی کے مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس وقت قربانی کے باب میں دو گروہ ہیں۔ ایک قربانی کے حق میں ہے۔ دوسرا مخالف۔ مودودی قربانی کے حق میں ہیں اور ایک جگہ طنزاً ارشاد فرماتے ہیں کہ

”پاکستان جو ہندو تہذیب کے تسلط سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو بچانے کے لئے بنایا تھا وہی آگے بڑھ کر ہندوؤں کو یہ رہنمائی دے کہ جہاں راج لگائے کی قربانی کیسی آپ تو ہر قسم کی قربانی از روئے قانون بند کر سکتے ہیں۔ یہ چیز سرے سے شعائر اسلام میں داخل ہی نہیں؟“

آپ نے اس میں کئی حدیثوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جن میں چند میسر نزدیک اور اسلام اور قربانی اسلام کو بدنام کرنے والے ہیں۔ مثلاً

حضرت علی فرماتے ہیں: رسول اللہ نے مجھ کو وصیت کی کہ میں ان کی طرف سے قربانی کرتا رہا کروں۔ چنانچہ میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔ (ابوداؤد ترمذی)

میری رائے میں یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ نے کبھی دنیاوی زندگی میں کسی کے سامنے وست سوال دراز نہیں کیا اس لئے وہ اخروی زندگی کے لئے بھی کوئی التجا کسی سے نہ کر سکتے تھے۔ دوم یہ کہ قربانی صرف واجب کی حیثیت رکھتی ہے۔ رسول اللہ نے نماز، زکوٰۃ اور روزے کی وصیت کیوں نہ کی جو فرض ہیں۔ واجب کا اس قدر خیال کیوں کیا۔

دوسری حدیث:

”ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا (ترجمہ) جو شخص جو قربانی کی طاقت رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے وہ میری مسجد میں نہ آئے۔ (مسند احمد - ابن ماجہ)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا تنہا مقصود صرف جانوروں کے حلق پر چھری پھیرنا تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص جو کتنے ہی بلند اخلاق رکھتا ہے محض اس وجہ سے متبعوض قرار دیا جائے کہ اس نے قربانی نہیں کی۔

تیسری حدیث

حضرت جابر عبد اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ نے مدینہ میں قربانی کے دن نماز پڑھائی اس کے بعد کچھ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر حضور سے پہلے قربانی کر لی۔ اس پر رسول اللہ نے حکم دیا جس نے ایسا کیا اسے پھر قربانی کرنا چاہیے کسی کو اس وقت تک قربانی نہیں کرنا چاہیے جب تک اس کا نبی اپنی قربانی نہ کرے۔ (مسلم: مسند احمد)

رسول اللہ نے کبھی اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں برتر و افضل تصور نہیں کیا، یہ حدیث آپ کی بلند اخلاقی پرشہید ضرب لگاتی ہے۔ جب صحابہ آپ کی تعظیم کرنے اور آپ کے آگے آگے آتے تو آپ فرماتے میں بھی تمہاری طرح کا ایک آدمی ہوں۔ اس حدیث نے رسول اللہ کا رشتہ آجکل کے خود غرض دنیا دار بادشاہوں کو جوڑ دیا حالانکہ آپ خاکساری و انکساری کا نمونہ تھے۔ آپ نے کبھی اپنے آپ کو برتر تصور نہیں کیا۔

اس قسم کی حدیثیں اسلام کی سادگی پر بدنامدار ہیں۔ اسلام سادگی و انکساری کا بہترین نمونہ ہے جس میں بادشاہ اور رعایا میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ مودودی صاحب کی پیش کردہ ایک حدیث اور ملاحظہ ہو: جو اسلام کو بزورِ شمیر پھیلانے پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا قربانی کے دن آدم کی اولاد کا کوئی فعل اللہ کو اس سے زیادہ پسند نہیں کہ وہ خون بہائے۔

اسلام کی ہر چیز کو حقیقت کی روشنی میں پرکھنے کے لئے قرآن موجود ہے۔ پھر ہم کیوں اس قسم کی کمزور حدیثوں کا سہارا لیں۔ قربانی تو اگر قرآنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی حیثیت صرف واجب کی ہے۔ قرآن نے اس کا ذکر نماز، زکوٰۃ اور روزے کی طرح تفصیل سے نہیں کیا۔ بلکہ سب سے بڑی طور پر کیا ہے۔ پارہ سترہ (۱۷) سورت الحج میں ہے۔

يَشْهَدُ وَامْنًا فَمَ لَهُمْ وَبَدُّهُوا
اسْمُ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَى
مَا رَزَقَهُم مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ
فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ
الْفَقِيرَ

اس سفر سے ان کا مقصود یہ ہوگا کہ اپنے فائدوں
یعنی تجارت کے لئے وقت پر آموجود ہوں گے (اور
خدا نے جو مولیشی چارپائے ان کو دیئے ہیں ان خاص
دنوں میں ان کی قربانی کرتے وقت ان پر خدا کا نام
لیں تو (لوگوں) قربانی کے گوشت میں سے (آپ بھی)
کھاؤ اور مصیبت زدہ کو بھی کھلاؤ۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو:

ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ه لَكُمْ فِيهَا مَافِع
إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ
الْعَتِيقِ ه وَكُلُّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مِنْكُمْ
لِذِكْرٍ وَالاسْمُ اللَّهُ عَلَى مَا رَزَقَهُمْ

قربانی دنوں کی پرہیزگاری میں داخل ہے ان (چارپایوں)
میں ایک وقت خاص تک تم لوگوں کے لئے فائدے
ہیں پھر جب تم نے ان کو قربانی کے لئے نام زد کر دیا
تو معبد قدیم یعنی (خانہ کعبہ) کے پاس جا کر ان کو
حلال کرنا چاہیئے۔ ہم نے قربانی قرار دی تاکہ خدا نے
جو ان کو مولیشی اور چوپائے دے رکھے ہیں قربانی
کرتے وقت ان پر خدا کا نام لیں۔

مندرجہ بالا آیات کو طرہ کر واضح ہو جاتا ہے کہ قربانی کن مصلحتوں کی بنا پر ضروری قرار دی گئی ہے — حج
ملت ابراہیمی میں اخوت کی تنظیم۔ مرکزی اتحاد کے قیام کا واحد ذریعہ اس زمانے میں گلہ بانی عام پیشہ تھا اور یہی
کسب روزی کا ذریعہ اس لئے اگر قربانی کو امداد و غوا کا ذریعہ تصور کر لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا — قرآن
کہتا ہے کہ خود کھاؤ اور محتاجوں کو کھلاؤ — ہم نے قربانی قرار دی تاکہ وہ ان چوپایوں پر جو انہیں دیئے ہیں قربانی
کرتے وقت خدا کا نام لیں قرآن کے اس مطلب کو سامنے رکھا جائے تو قربانی کے فرض یا واجب ہونے
کا سوال ختم ہی ہو جاتا ہے۔ قرآن ان لوگوں سے قربانی کے لئے کہتا ہے جو مولیشی پالتے ہیں — مولشیوں
سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں اس لئے موجودہ دور میں جبکہ گلہ بانی دیہاتوں پر موقوف ہو گئی ہے اور
کثرت ان لوگوں کی ہے جو ملازمت اور دوسری تجارتوں سے اپنی روزی کماتے ہیں ہم اگر روپے یا دوسری
اشیاء سے غوا کی مدد کریں تو یہ ہمارے لئے قربانی کا بدل ہو جائے گا۔

آجکل جو قربانیاں ہو رہی ہیں اس کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں۔ قرآن تو کہتا ہے (خانہ کعبہ کے پاس جا کر قربانی کرو)
یعنی جو شخص حج کرے اس پر قربانی واجب ہے نہ یہ کہ اس زمانے میں ہر مسلمان پر خواہ وہ کعبہ سے کتنی ہی دور کیوں
نہ ہو قربانی واجب ہے۔

ایک جگہ مودودی صاحب لکھتے ہیں: مسلمانوں میں اختلاف کی کیا کمی تھی جو قربانی کے موقعے یا مکے پر بھی
ان میں اختلاف پیدا کیا جا رہا ہے۔
مجھے اندسوس اور تعجب ہے کہ آپ نے یہ لکھتے وقت یہ نہ سوچا کہ اس رائے پر متفق ہونے کے معنی یہ ہوں گے

کہ وہ فضول خرچی پر متفق ہو گئے یا نام و نمود پر۔

رسول اللہ نے اپنے عہد کے حالات کو پیش نظر رکھ کر قربانی ضروری قرار دی تھی لیکن اب قربانی کی اہمیت باقی نہیں رہی۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمان مسئلہ قربانی پر متفق ہیں تو اس کو اتفاق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ وہ اسے فرض سمجھ کر ادا نہیں کرتے بلکہ مناتے ہیں۔ اور اس عقیدت کے تحت کہ قربانی کے جانور کے ختنے بال ہوں گے اتنے ہی گناہ معاف ہو جائیں گے۔ حیرت ہے کہ تمام سال تو آپ ہر قسم کے لہو و لعب اور فسق و فجور میں مبتلا رہیں اور صرف ایک جانور ذبح کر دینے سے آپ کے تمام گناہ دھل جائیں۔

قربانی سے رسول اللہ کا مقصد اولین یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت کی تمام بُری رسموں کو جو قربانی کے سلسلے میں رائج ہو گئی تھیں ختم کر دیا جائے اور عہدِ ابراہیمی کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے خدا کے نام پر قربانی کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ اس میں اجاب اور مسکینوں کا حصہ نکال کر حساب نوازی کا موقعہ دیا جو اتحاد اتفاق کا ذریعہ تھا۔

قرآن میں قربانی کا ذکر سری طور پر کئی جگہ آیا ہے۔ قربانی کا ذکر جہاں حج کے ساتھ آیا ہے وہاں وہی قربانی مقصود ہے جو حاجیوں پر فرض ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں ذکر آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ کے نام کی قربانی کی جائے۔ زمانہ جاہلیت میں یہود قربانی کئی طرح کرتے تھے۔ مردوں کی قبر پر قربانی کی جاتی تھی۔ اذنی کے پہلے بچے کی قربانی کی جاتی تھی۔ اسلام نے تمام قربانیوں کو حرام ٹھہرا کر صرف اللہ کے نام کی قربانی جائز کر دی۔

مودودی صاحب کا یہ ارشاد درست ہے کہ ہر معاشرہ فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اس میں کچھ اجتماعی تہوار دیئے جائیں جس میں اس کے تمام افراد مل کر خوشیاں منا سکیں لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ قربانی کے بغیر تہوار کی خوشی کیوں مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیا عید الفطر کی خوشی ادھوری اور نامکمل ہے؟ کیا عید گاہ میں تمام افراد مل کر خوشیاں نہیں مناتے؟ کیا قربانی کے بغیر اتحاد ناممکن ہے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ گلہ بانی کرتے ہر سال روپیہ کماتے ہیں۔ اگر قربانی بند کر دی جائے تو یہ لوگ گلہ بانی کا پیشہ ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے بجائے اس کے کہ گلہ بانی کو فروغ دیا جائے اسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گلہ بانی کا پیشہ ختم تو کسی صورت سے ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ہزاروں جانور روزانہ کام آتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ مویشی کٹ جانے کے باعث مویشیوں کی قلت ہو گئی ہے۔ دودھ، گھی، گوشت ضرورت سے زیادہ گراں ہو گیا ہے اور ان چیزوں کی گرانی دوسری اشیاء پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ ہمارے یہاں کے گلہ بان زیادہ تر مویشی اس لئے پرورش کرتے ہیں تاکہ قربانی کے موقع پر روپیہ کما سکیں اگر ان کی توجہ اس طرف سے ہٹ جائے تو وہ چوپایوں کو گھی اور دودھ کے لئے پرورش کریں اور ان کی نسل کو بڑھانے کی کوشش کریں۔

اگر قربانی کو فرض کا رتبہ دے بھی دیا جائے تو قرآن کی روشنی میں قربانی صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو حج کرنے ہیں۔ عہدِ رسول اللہ میں مسلمانوں کی تعداد کیا تھی مسلمان مکہ۔ مدینہ اور قریب کے کچھ مقاموں میں محدود کچھ حج کے موقع پر تقریباً سب ہی حج ادا کرتے تھے۔ اور اسی لئے قربانی بھی کرتے تھے۔ قرآن کے ارشاد کے

مطالب غیر حاجیوں کے لئے قربانی کی ضرورت نہیں۔ اب اگر ہم قربانی پر صرف ہونے والی رقم کو قومی فلاح و بہبود اور غریب پروری پر صرف کریں تو کیا خلاف دانش مندی ہے۔

قربانی کا مسئلہ ہمارے لئے اتنا اہم نہیں ہے کہ ہم قلم اور زبان سے جہاد کرنے کے لئے میدان میں نکل آئیں ہمارے معاشرے میں جو ہر اکیلا جنم لے رہی ہیں ان کے تدارک کے لئے اگر ہم میدان میں نکل آئیں تو بے شک دین کی خدمت ہوگی۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
(اقبال)

نگار پاکستان ۱۹۶۲ء کا سالنامہ

تذکروں کا تذکرہ نمبر

مئی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوگا

اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کرے گا کہ :-

- ۱۔ تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے ؟
- ۲۔ اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں ؟
- ۳۔ تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ؟
- ۴۔ اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ؟
- ۵۔ ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے ؟
- ۶۔ ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ؟
- ۷۔ ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے ؟
- ۸۔ ان تذکروں میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے ؟
- ۹۔ یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے۔

طحا امت :- ۳۰ صفحات

قیمت :- چار روپے

شہادت عظمیٰ

(گزشتہ سیمے پیوستہ)

محمد سلیمان اختر

اگر آج جس جگہ کی جائے تو دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک کتاب ایسی موجود نہیں ہے جو واقعہ کربلا کی تاریخ ہو تو واقعہ یہ ہے کہ ایک بھی نہیں۔ رسول اللہ کے نواسے حسین نے جان دی لیکن ہاتھ نہ دیا۔ مریا بات نہ جانے دی۔ لیکن جابر و غاصب کو اپنی زندگی کے آخری لمحوں اور سانس تک جابر و غاصب ہی کہتے رہے۔ کوئی مصلحت اندیشی، کوئی تہویل طرازی، عزم حسین میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔

ابا ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام عالی مقام نے یہ راہ آخر کیوں اختیار کی۔ اور جان بوجھ کر اپنی امد تمام اعزاء و اقرباء اور فقہاء کی جانیں کیوں قربان کر دیں۔ حالانکہ آپ چاہتے تو یزید کی بیعت کر کے ساری عمر عیش میں بسر کرتے۔

امام عالی مقام نے یہ راہ سرفروشی اس لئے اختیار کی کہ حق و صلاقت کو بے حرمتی سے بچائیں اور شریعت حقہ کے ایک ایک حکم کو تین دلائل سے محفوظ رکھیں تاکہ ان کے بعد تیا مت تک کے لئے یہ اسوۂ حسینی قائم ہو جائے کہ جب بھی حق و باطل کا تصادم ہو۔ باطل حق پر غلبہ ہوئے کی کوشش کرے۔ شعائر و احکام اسلام کی خلاف ورزی و توہین کی جائے تو باوجود ہر قسم کی بے سروسامانی اور تعداؤں کی کمی کے قربانی و فداکاری کی راہ اختیار کی جائے۔

قطع نظر اس کے ابن زیاد کے پاس جس روز سر حسین پہنچا اس کے دو سکرے رفد عمر بن سعد بھی کئی اہل بیت کو لے کر وہاں پہنچا۔ اب ابن زیاد نے قلعہ کے اندر ایک جلسہ عام کیا جس میں ہر خاص و عام کو شرکت کی اجازت تھی۔ پھر اس نے سر حسین کو اپنے سامنے منگوا یا۔ اور بار بار چھڑی سے بے ہاتھ حسین کو مارتا تھا۔ اور ہنس ہنس کر ٹھٹھول کرتا تھا۔ حضرت زید بن ارقم (جو رسول اللہ کے صحابی تھے) اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بے اختیار ہو کر کہا، خدا کی قسم میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ان سب ہاتھ مبارک کا بوسہ لیا کرتے تھے۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگے۔ اس پر ابن زیاد و غصہ سے ہل پھلا ہو گیا۔ اور کہا کہ اگر تو بڑھا نہ ہوتا تو میں یقیناً تجھے قتل کر دیتا۔ اس کے بعد زید بن ارقم وہاں سے چلے گئے۔

حضرت امام عالی مقام کی کل عورتوں اور بچوں کو ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا۔ ان سب میں سب سے زیادہ بری حالت میں حضرت زینب تھیں۔ پھر ابن زیاد نے زین العابدین سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ انھوں نے کہا میں علی بن حسین ہوں۔ ابن زیاد نے کہا۔ کیا خدا نے تجھے ہلاک نہیں کیا۔؟ آپ نے فرمایا کہ میرے ہی ایک ہم نام بھائی کو ان لوگوں نے شہید کر ڈالا ہے۔ یہ شکر ابن زیاد نے کہا۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ اللہ نے مار ڈالا ہے۔ ابن زیاد نے غصہ میں آکر مری بن معاویہ کو حکم دیا کہ دیکھ یہ بالغ معلوم ہوتا ہے اگر بالغ ہو تو فوراً قتل کر ڈال جب اس نے دیکھا تو آپ فی الواقع بالغ تھے۔ اس سے حضرت زینب کو بڑی گھبراہٹ ہوئی اور انھوں نے کہا کیا ابن زیاد اب بھی ہمارے خون سے تیری پیاس نہیں بجھی۔ جو ہماری نسل کو بھی منقطع کرنا چاہتا ہے۔ خدا کی قسم! میں ہرگز اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی اور اگر تو ان کو قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو پہلے مجھے قتل کر ڈال۔ یہ زہرہ گدا ز فریاد سن کر اس پر یک گونہ رقت طاری ہوئی اور وہ عابد بیمار کے قتل سے باز رہا۔ اس کے بعد اس نے مسجد میں الصلوٰۃ جامعہ کی تلاوت کی اور اعلان کیا اور جب لوگ جمع ہوئے تو منبر پر چڑھ کر اپنی تقریر میں کہا کہ خدا

کا شکر ہے کہ جس نے امیر المومنین یزید بن معاویہ اور ان کے ہمدردوں کی مدد کی اور کذاب ابن کذاب (حسین بن علی) اور اس کے مددگاروں کو تباہ و برباد کیا۔ ابن زیاد کی اس بذر بانی سے عبداللہ بن عقیف ازدی ضبط سے باہر ہو گئے اور انھوں نے غصہ میں کھڑے ہو کر کہا۔ تو اولاد نبی کو قتل کر کے منبر پر کھڑے ہو کر ان لوگوں کو کذاب کہتا ہے کذاب تو خود ہے اور تیرا باپ ہے اتنی سخت بات ابن زیاد کی زکرت برداشت کر سکتا تھا حکم دیا کہ اسے فوراً گرفتار کر کے قتل کر دو۔ لیکن عبداللہ بن عقیف نے یا مبرور کی صدا بلند کی جس کے سبب بہت سے ازدی نوجوانوں نے نہ بچ کر انھیں قتل ہونے سے بچا لیا مگر رات کے وقت ابن زیاد نے انھیں گھر پر گرفتار کر کے قتل کر دیا اور ایک شوریدہ زمین میں ان کی لاش تختہ پر لٹکا دی گئی۔

صبح کے وقت ابن زیاد نے حضرت امام عالی مقام کے سر کو نوہ کی گلیوں میں نیزہ پر گشت کرانے کے بعد کل سروں کو زحر بن قیس کی معرفت یزید بن معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ سروں کو بھیجنے کے بعد حضرت زین العابدین کے گلے میں طوق ڈال کر کل عورتوں اور بچوں کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر بٹھا کر سب کو محضر بن ثعلبہ عائذی اور شمر بن ذی الجوشن کی قیادت میں بھیجا دیا۔ دمشق میں جب زحر بن قیس نے یزید کو سارا واقعہ سنایا تو ابن جریر و کثیر کے بیان کے مطابق یزید اپنی فتمیلیاں اور ظفر مندی پر خوش ہوا اور ابن زیاد کو انعام و اکرام سے نوازا۔

اہل بیت کو کچھ عرصہ قید میں رکھنے کے بعد یزید نے قافلہ حسین کو مدینہ بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی اور کچھ مراعات بھی دیں۔ چنانچہ جناب زین العابدین جمعہ کے دن جامع مسجد دمشق میں تقریر کرنے کیلئے پہنچے تو یزید نے شاہی خطیب کو حکم دیا۔ خطیب نے اہل البوسفیانہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ اور حضرت علی اور ان کی اولاد پر سخت لعن طعن شروع کیا۔ زین العابدین یہ سکر بے تاب ہو گئے اور فوراً منبر پر چڑھ کر فرمایا۔ اے اہل شام میں سید الانبیاء کا دل بند ہوں میں اس کا فرزند ہوں جو مدینہ العلم النبی کا باب نخواستہ میرے دادا امام المشرق والمغرب مظہر العجائب وغرائب، اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب ہیں۔ میں اس راکبِ دوشِ نبی کا لال ہوں جسے تمہاری ستم رانیوں نے میدانِ کربلا میں تشنہ لب شہید کر دیا ہے۔ آیت تطہیر کی نورانی کلمی اور ٹھنڈے دے تہجد گزار کی آخری نشانی ہوں جس کی لاش آج بھی کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں بے گورد کفن پڑی ہوئی ہے۔ جناب زین العابدین یہیں تک تقریر کرنے پائے تھے کہ مسجد میں شور مچا م برپا ہو گیا۔ بنی امیہ کے چہرے زرد پڑ گئے۔ یزید گھبرا گیا۔ فوراً موزن کو افان کہنے کا حکم دیا۔ جس وقت موزن نے اشہدان محمد رسول اللہ کہا۔ امام زین العابدین نے عامرہ سے اتارا۔ حمیرہ مبارک پر زلفیں بھر گئیں موزن سے کہا مجھے اس نام پاک کی قسم ہے رک جا پھر آپ نے یزید سے پوچھا۔ سبحان محمد رسول اللہ میرے باپ سید الشہداء کے جگر محترم ہیں یا تیرے پھر لو نے ان کو بے جرم و خطا کیوں شہید کیا۔ اے دشمن رسول! اے البوسفیانہ کے ہوتے سبحان محمد رسول اللہ میرے دادا کا کلمہ پڑھنے کے بعد اس کے ناموس کی دمشق کی گلی کوچوں میں کیوں تشہیر کرائی۔ یہ کہہ کر آپ جو شش غم میں بابا حسین کا نعرہ لگا کر بے اختیار رونے لگے۔

اہل شام کا مسجد میں روتے روتے برا حال تھا خود یزید فرطِ بیت سے کانپنے لگا موزن کو حکم دیا کہ اقامت کہے تاکہ لوگ نماز کیلئے کھڑے ہو جائیں۔ جامع مسجد دمشق میں زین العابدین کی پرائر تقریر سے یزید پر خوف طاری ہوا اور سوچا کہیں اہل شام اس کے خلاف جہاد نہ کریں اس اندیشہ و خطرے کے تحت نعمان بن بشیر کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو شام کے کسی معتدلہ شخص کی نگرانی میں مدینہ پہنچایا جائے اور اثناء سفر میں جن چیزوں کی ضرورت ہو ان کی فراہمی کا بھی انتظام کیا جائے اس کے علاوہ کچھ اور سوار و مددگار بھی شامل کر لئے جائیں اور تا کیہ کی کہ رات کے وقت اہل بیت کی ساریاں آگے رکھی

جائیں اور خود یہ لوگ پیچھے رہیں تاکہ پورے طور پر ہجرت ہو سکے اور نظر سے اچھل نہ ہو سکیں۔ الغرض جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا۔ تو حضرت علی کی صاحبزادی فاطمہ نے حضرت زینب سے کہا۔ اس شخص نے ہم لوگوں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا ہے اور بڑی محنت اور احتیاط سے یہاں تک پہنچایا ہے اس لئے اسے انعام دینا چاہیے۔ چنانچہ اسے انعام دیا گیا لیکن اس نے اپنے سے انکار کر دیا اور کہا ہم نے جو کچھ بھی آپ لوگوں کیساتھ کیا ہے وہ کسی دنیاوی غرض کی خاطر نہیں کی بلکہ محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا ہے اور اس لئے بھی کہ آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں۔ جس وقت نعمان بن بشیر کی معیت میں کربلا کا یہ لٹا ہوا قافلہ مدینہ پہنچا تو شور مارتے مدینہ کا دروازہ لڑاٹھا۔ اہل بیت کے آنے سے پہلے مدینہ میں یہ جانگسل خبر پہنچ چکی تھی۔ بنی ہاشم کی خاتونوں نے سنا تو گھروں سے چلائی ہوئی تنکل پڑیں اور مدینہ میں ایک کھرام مچ گیا۔ روضۂ اطہر پر نظر پڑتے ہی حضرت زینب رورور کر فریاد کرنے لگیں اور کربلا کے درد انگیز اور جگر سوز واقعات بیان کر کے طوفانِ ماتم برپا کیا۔

واقعات کربلا کے کچھ ہی دن بعد شدتِ احساس سے یزید بہت کچھ بتانے لگا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین کی شہادت سے لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں اور اس پر لعنت و ملامت کرتے ہیں تو وہ لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے حسین سے جنگ کی ابنِ مرجانہ پر خدا کی لعنت اس نے حسین سے مطلق ہمدردی نہیں کی نہ اس نے انہیں واپس ہی ہونے دیا نہ ہی مجھ سے ملنے کا موقع دیا اور نہ کسی دوسرے علاقہ میں جانے کی اجازت دی۔ بلکہ ان کو قتل کر کے تمام مسلمانوں کو میرا دشمن بنا دیا اور سب کے دلوں میں میری علوت کا بیج بو دیا۔

الغرض یزید کے خدشات واقعات میں تبدیل ہونے لگے۔ نتیجتاً شہادتِ حسین کی اطلاع پا کر نجبرہ بن عامر حنفی نے پیامہ میں اور عبداللہ بن زبیر نے حجاز میں خراج کر دیا۔ جب یزید کو معلوم ہوا تو ۶۱ھ میں والی تھجاز عمرو بن سعد کو وہاں سے معزول کر کے ان کی جگہ ولید بن عقبہ کو امیر مقرر کر دیا۔ پھر ۶۲ھ میں وہ بھی علیحدہ کر دیتے گئے اور عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو بحال کر دیا گیا۔ مگر چونکہ وہ ایک ناتجربہ کار جوان تھا اس سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے یزید کے یہاں روتا۔ مدینہ کا ایک وفد بھیجا جس سے اور بھی فتنہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہر چند یزید نے اس وفد کی بڑی عزت و توقیر کی لیکن یہ لوگ یزید کی شخصی ذاتی برائیوں کو بحشم خود دیکھ چکے تھے واپس آکر لوگوں سے بیان کیا کہ ہم لوگ یزید کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں کہ وہ نہایت گمراہ شخص ہے۔ شراب پیتا ہے۔ ستار بجاتا ہے۔ اس کی محفل میں لونڈیاں ناچتی اور گاتی ہیں۔ مدینہ کے اس وفد میں اتفاق سے ایک عابد و زاہد بزرگ حضرت عبداللہ بن حنظلہ انصاری بھی تھے۔ جو ابنِ غیسل الملائکہ کہے جاتے تھے ان کے آٹھ بیٹے تھے انھوں نے کہا یزید کافری میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر ایک شخص بھی میرا ساتھ نہ دے تو کوئی مضائقہ نہیں میں اپنے لڑکوں کو لے کر ہی یزید سے جہاد کروں گا۔ یہ سنکر سب لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ دی اور اپنا امیر عبداللہ بن حنظلہ کو بنالیا اور ۶۳ھ میں اہل مدینہ نے عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو کل بنی امیہ اور ان کے غلاموں کو جو ایک ہزار سے زیادہ تھے مدینہ سے نکال دیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی یزید نے مسلم بن عقبہ مزنی عت مسرت کو بارہ ہزار فوج دے کر مدینہ بھیجا۔ وہ وہاں حرہ کی طرف سے داخل ہوا پہلے تو لوگوں کو خوب ڈرایا دھمکایا اور تین دن کی ہتھکڑی دی۔ مگر جب یہ سب بے اثر ثابت ہوا تو تین دن گزرنے پر فریقین میں گھسان کی لڑائی ہوئی اور جب عبداللہ بن حنظلہ کے سب لڑکے ایک ایک کر کے اپنے باپ کے ساتھ شہید ہو گئے اور وہ اہل مدینہ پر غالب آ گیا۔ تو اس نے وہاں قتل عام کا حکم دیا چنانچہ تین دن تک اس قدر قتل و غارتگری ہوئی کہ خدا کی پناہ، مورخین نے لکھا ہے ایک ہزار و شیش لڑکیوں کی عصمت یزیدی گئی۔ زہری کی روایت ہے کہ حرہ کے مقتولین میں قریش، ہاشم، بنی انصاریہ سے سات سو کی تعداد میں وہ

صحابہ رسول قتل کئے گئے جو عام طور سے لوگوں میں قابل احترام اور لائق تعظیم سمجھے جاتے تھے اور وہ سردار مارے گئے جو دہنوار غلاموں کے مالک تھے۔

انصار، مہاجر، اور اہل بدر کی نسلیں بھی قتل کر دی گئیں، اور جو صحابہ اور تابعین قتل نہیں ہوئے تھے ان سے یزید کی غلامی کی بیعت لی گئی اور حضرت زین العابدین سے چھرے بھائی ہونے کا اقرار لیا گیا۔ یہ خصوصیت اور رعایت ان کے ساتھ اس لئے کی گئی تھی کہ یزید نے مسلم بن عقبہ کو ایسی ہی ہدایت کی تھی۔ تاکہ وہ اوروں کی بیعت کی زد میں نہ آئیں۔ اس لئے حضرت علی بن عبد اللہ بن عباس وہاں سے فرار ہو کر کندہ چلے گئے جہاں ان کے ماموں نے انھیں پناہ دی۔ اور مسلم بن عقبہ کو لکھا کہ ہمارے بھانجے کو بیعت سے انکار نہیں ہے مگر وہ صحت یہ چاہتے ہیں کہ حضرت زین العابدین کی طرح بیعت کریں۔ مسلم بن عقبہ نے جواب دیا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے امیر المومنین کے حکم سے کیا ہے اگر امیر المومنین (یزید بن معاویہ) کا حکم نہ ہوتا تو میں زین العابدین کو بھی قتل کرتا کیونکہ اس خاندان والے قتل ہی کئے جانے کے لائق ہیں۔

قطع نظر اس کے حضرت عبد اللہ بن زبیر نے بھی شہادت حسین کی خبر سن کر اہل مکہ کے سامنے نہایت اہمیت کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا اور اہل عراق کو عموماً اور اہل کوفہ کی خصوصاً مذمت کی اور قاتلین حسین کو ملعون قرار دیا۔ اور کہا کہ چند اشخاص کے ماسوا۔ باقی سارے اہل عراق غلام اور فاسق ہیں اور ان سب میں زیادہ فتنہ پرداز اہل کوفہ ہیں جنہوں نے حضرت حسین کو ہلاک دھوکہ دیا۔ ان کی مدد کرنے کی بجائے ان سے کہا کہ ہمارے ہاتھوں گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس چلو۔ مگر امام عالی مقام اپنے معدودے چنا صحاب کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو گئے۔ اور دولت کی زندگی کو عزت کی موت پر ترجیح دی۔ غرض عبد اللہ بن زبیر نے بڑے زور سے لوگوں کو نبی مہیہ کے خلاف ابھارا اور یزید کی بیعت توڑنے کی تحریک شروع کر دی۔ اسی لئے مسلم بن عقبہ نے اہل مہینہ کے قتل غارت گری سے فارغ ہو کر حضرت عبد اللہ بن زبیر پر حملہ کرنے کے ارادہ ہوا لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ موت کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔ مسلم بن عقبہ کے بعد حصین بن نمیر کو امیر الحبش بنا دیا گیا۔ جس نے ساتویں محرم ۶۲ھ کو مسلم بن عقبہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر مکہ کا رخ کیا اور ۲۶ محرم ۶۲ھ کو وہاں پہنچ کر عبد اللہ بن زبیر کا محاصرہ کر لیا۔ عبد اللہ بن زبیر کی طرف سے لڑنے والے ایک تو اہل حجاز تھے دوسرے وہ اہل مہینہ تھے جو مسلم بن عقبہ کے لشکر سے شکست کھا کر بھاگ نکلے تھے، تیسرے خوارج تھے جن کے سردار نجدہ بن عامر تھے حصین بن نمیر نے جب زبیر کا محاصرہ کر لیا اور مقابلہ ہوا تو حضرت زبیر کے لوگ اہل شام کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ اسی مقابلہ میں عبد اللہ بن زبیر کی چھری زخمی ہو گئی۔ چنانچہ آپ پیدل لڑنے لگے۔ پھر شام ہوئی لڑائی سات بھر کے لئے ملتوی ہوئی لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ صفر کا پورا مہینہ اسی میں گزر گیا۔ اور جب ربیع الاول کے بھی تین روز گزر گئے تو حصین بن نمیر کی فوج نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا اور منجیقوں کے ذریعہ کعبہ پر سنگباری کی گئی۔

واقعہ شہادت ہی ماحصل وہ عظیم ترین واقعہ تھا جس کی وجہ سے کئی واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ ایک تو نجدہ بن عامر کا یامہ میں خروج کرنا اور دوسرا عبد اللہ بن زبیر کا حجاز میں یزید کا خلع کرنا اور تیسرا خون حسین کے انتقام کے لئے توابعین کی جماعت کا قائم ہونا ایسی واضح حقیقتیں تھیں کہ اس سے مجال انکار ہی ممکن نہ تھا مختصراً یہ کہ شہادت حسین کے بعد کوفہ کے شیعہ اپنی اس غلطی پر سخت نادم ہوئے کہ انھوں نے حضرت حسین کو کوفہ ہلا کر ان کی کوئی مدد نہیں کی جس کے سبب وہ شہید ہو گئے۔ اس لئے انھوں نے سوچا کہ اب اس گناہ عظیم کا کفارہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ قاتلین امام عالی مقام کو قتل کر کے

ان سے خون حسین کا انتقام لیا جائے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنی جماعت کا نام تو ابین رکھا۔ کیونکہ امام عالی مقام کی مدونہ کر کے انھوں نے بڑی غلطی کی اس سے توبہ کر کے تائیلین سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سلسلے میں سب سے اول اس جماعت نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ خفیہ طور سے لوگوں کو تائیلین شہیدان کر بلا کے خون کا انتقام لینے پر اکسانے لگے۔ اور ۶۷ھ سے سامان حرب اور اسلحہ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ لیکن یہ معاملہ ابھی پوشیدہ ہی تھا اور واقعہ شہادتِ حسین کو گزرے صرف تین سال دو ماہ چار دن ہوئے تھے اور حصین بن نمیر کی فوج کو خانہ کعبہ پر حملہ کئے چونستھ دن ہی گزرے تھے کہ ۱۲ ربیع الاول ۶۸ھ کو یزید بن معاویہ اچانک مرگیا۔ یزید کی اچانک موت کی خبر حصین بن نمیر کو پہنچی تو وہ خانہ کعبہ کی مہم سے واپس آ گیا۔

یزید بن معاویہ کے بعد معاویہ بن یزید تخت نشین ہوا لیکن وہ بھی تین ماہ کے بعد انتقال کر گیا۔ پھر مروان بن حکم تخت پر بیٹھا اس سے اہل کوفہ نے سمجھا کہ اب اہل شام کی طاقت ختم ہو گئی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اب کسی میں اس بار کے سنبھالنے کی صلاحیت باقی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر پانچ بڑے بڑے رئیسوں کے اتفاق سے مسلمانوں کا ایک عام اجلاس طلب کیا گیا جس میں تمام اہل کوفہ شریک ہوئے اور بڑی معرکتہ الّا تقریباً ہوئی۔ بالآخر سلیمان بن صرد (جو صحابی رسول تھے) قائد اعظم منتخب ہوئے اس بالکل عام اعلان کیا گیا کہ اس جماعت کا ساتھ دیں نیز مدائن اور بصرہ کے شیعوں کو خط لکھ کر اطلاع دی گئی چنانچہ ہر جگہ سے لوگوں نے موافقت میں جواب دیا۔

اس اجتماع اور اتفاق رائے کے بعد اہل کوفہ نے اپنے یہاں عبداللہ بن زبیر کی خلافت تسلیم کر لی اور اپنے سابق امیر عمرو بن حرث کو وہاں سے نکال دیا۔ غرضیکہ امام حسین کی شہادت کے بعد عراق، حجاز، یمن اور شام تک میں لوگوں نے بنی امیہ کے خلاف خروج کر دیا تھا۔ اور یہی ان کی سلطنت کی تباہی کا سب سے بڑا سبب بنا اور حقیقت یہ ہے کہ مدینہ کے اندر قتل و غارت گری اور کعبہ شریف کو منہجیتوں کا نشانہ بنانا اور اس میں آگ لگانا یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ واقعہ شہادت نے ان کے دل و دماغ کو مختل کر دیا تھا۔

یہ تو واقعہ ہے کہ یزید اور اس کے بڑے معاویہ کے انتقال کے بعد ہی حکم بن مروان نے چاہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لی جائے لیکن اس کے بعض حامیوں نے اسے ایسا کرنے سے روکا ورنہ اسی وقت بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا مگر بنی امیہ کی حکومت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکی۔

مختصر یہ کہ بنی امیہ کے زوال، اور خلافت بنی عباس کے قیام کا اصلی سبب یہی واقعہ کر بلا تھا۔

آنحضرت کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ منتخب ہوئے تو ابوسفیان، حضرت علی کے پاس گئے اور کہا۔ خدا کی قسم! اگر تم کہو تو میں تمہاری مدد کے لئے مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔ مگر حضرت علی امت میں تفرقہ ڈالنے کے روافد نہ تھے۔ آپ نے نہایت سختی سے کہا۔ تم جاہلیت میں ہمیشہ اسلام کے دشمن رہے۔ اب اسلام لانے پر دشمنی سے باز نہیں آتے۔ (الاستیعاب) حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو آنحضرت نے فاطمہ، علی، حسن، حسین کو اپنی حادریں پٹا اور کہا۔ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان کو اپنا مقرب و محبوب بنا اور مسلمانوں کو ان سے محبت و نصرت کی تاکید فرما (ترمذی) علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ حدیث کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے پورے نوے

سال سندھ ایشیا۔ کوچک اور اندلس تک مساحد میں آل فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علی پر لعن کہلوا یا۔

معاویہ نے جن سے مدعا کئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کریں گے۔ لیکن کیا۔

دوسرے یہ کہ وہ علویین کے خلاف کسی انتقامی جذبے سے کام نہ لیں گے۔ لیکن اس عہد کو سب توڑا اور محض ٹک و شبہ پر

سینکڑوں علویں کو تہ تیغ کیا۔ یہاں تک حجر بن عدی ایسے عظیم المرتبت صحابی و مجاہد بھی ان کے ہاتھ سے نہ بچ سکے۔ اور یہ ایسا دلہندہ واقعہ ہے کہ خود ان کے افراد خاندان نے بھی اسے صدمہ و جسد قابل اعتراض قرار دیا۔ چنانچہ بلاذری لکھتا ہے کہ معاویہ نے ایک دن نماز کو بہت طویل دیا تو ان کی بیوی نے کہا

ما احسن صلا قتل یا امیر المومنین لولا انک قتلت حجر و اصحابہ

اے امیر المومنین آپ کی نماز کتنی اچھی ہوئی اگر آپ نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک نہ کیا ہوتا۔ (طبری) مورخین کا بیان ہے کہ معاویہ کی زندگی کی آخری ساعتیں بھی نہایت کرب و اضطراب میں گزریں کیونکہ ان کا ضمیر قتل حجر پر ان کو ملامت کرتا تھا۔

ایک بار حضرت علی کے بھائی عقیل بن ابی طالب علیؓ سے کچھ امداد چاہی۔ آپ نے حسن سے مخاطب ہو کر کہا کہ اپنے چچا کیساتھ بازار جاؤ اور انہیں ایک جوڑا کپڑا اور جو تے خریدو، اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد جب عقیل امیر معاویہ کے پاس گئے تو انہوں نے ایک لاکھ درہم بیت المال سے نکال کر دیئے۔

امیر معاویہ بیت المال کو مسلمانوں کا مال نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی ملکیت۔ اپنی مقصد براری کے لئے جس طرح چاہتے صرف کرتے تھے۔ ایک بار جب صعصفہ بن مسود جاتی نے اعتراض کیا تو معاویہ نے کوٹک کر کہا۔

الارض للہ وانا خلیفتہ اللہ فہما اخذت فلی و ما ترکتم للناس فیا الفضل منی۔

زمین خدا کی ہے اور میں خدا کا نائب ہوں جو کچھ میں لیتا ہوں وہ میرا ہے اور جو لوگوں کے لئے چھوڑتا ہوں وہ محض میری مہربانی ہے۔

بعد کو یزید بن معاویہ نے بھی اسی پالیسی پر عمل کیا۔ ایک بار عبداللہ بن جعفر یزید کے پاس گئے۔ یزید نے پوچھا میرے باپ کے زمانہ میں آپ کو کتنا وظیفہ ملتا تھا۔ بولے دس لاکھ درہم۔ یزید نے کہا۔ میں مدچند کئے دیتا ہوں۔ عبداللہ بن جعفر نے کہا اس سے قبل میں نے کسی سے نہیں کہا تھا کہ میری تنخواہ کم ہے۔ یہ سنکر یزید نے کہا۔ میں اس کو چارچند کئے دیتا ہوں۔ یہ سنکر بعض نے اعتراض کیا تو یزید نے کہا۔ یہ رقم ایک شخص کو نہیں بلکہ سارے مدینہ کو دی گئی ہے۔ (عقد العزید)

مسعودی لکھتا ہے کہ یزید اپنے وقت کا زیادہ حصہ سیر و شکار میں بسر کرتا تھا۔ شراب کا بھی سخت عادی تھا۔ اسی کے عہد میں موسیقی کا رواج حرین میں شروع ہوا۔ جس سے اس وقت تک مسلمان نا آشنا تھے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ یزید اپنے نفوڑے عہد میں (۳ سال۔ عمر ظالم کرتاہ) نین سنگین جرم ایسے سرزد ہوئے کہ امت مسلمہ کبھی معاف نہ کرے گی۔ قتل حسینؑ، واقعہ الحرةؑ۔ جہیں مدینہ منورہ پر چڑھائی کی گئی تین دن تک شہر میں لوٹ مار غارت گری رہی،

اور حملہ مکہ معظمہؑ (جہیں حرم کعبہ پر منہجیت سے سنگباری کی گئی اور غلام کعبہ جل گیا) صحابہ کا قتل ہے کہ یزید کے اعمال ایسے تھے کہ اگر ہم اس پر خروج نہ کرتے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسے۔

بخلاف اس کے یزید بن معاویہ کے پیشرو خلفاء کا یہ احساس فرض شناسی طرہ امتیاز تھا کہ حضرت علیؑ کو ضرورت ہوتی تو بیت المال سے فرض لیتے اور ایک ایک درہم واپس کر دیتے۔ علیؑ کی عسرت کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک کرتہ جم پر ہوتا اور آپ سرودی سے کانپتے مگر بیت المال کو ہاتھ نہ لگاتے۔ اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار آپ کھجوریں لئے جا رہے تھے لوگوں

نے کہا کہ میں ویدیکہ ہم پہنچا دیں گے لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

حسین بالیقین یزید سے ہر اعتبار بدرجہا بہتر مسلمان تھے جس سے یزید کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اور یہیں سے بات صاف اور آئینہ ہو جاتی ہے کہ معاویہ کے بعد نسبتاً یزید کے حضرت حسین ہی فی الواقع زیادہ مستحق خلافت تھے۔ اس لئے اگر حسین نے یزید کی خلافت تسلیم نہیں کی تو یہ ان کے کردار کی خود اعتمادی اور ان کے ضمیر کی صداقت و جرات تھی اور اس کے خلاف ان کا خروج اسلامی فرض تھا جو انھوں نے پورا کیا اور اس طرح پورا کیا کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ واقعہ شہادت حقیقتاً دنیا کی تاریخ کا ایک ایسا اہم واقعہ ہے جو تاریخ و ہر میں سب سے پہلی اور آخری مثال ہے۔ دنیا آج تک ایسا ایک بھی واقعہ پیش نہیں کر سکی اور نہ آئندہ کر سکے گی۔

دنیا کی تاریخ کئی اہم معرکوں اور جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ کئی ایسے معرکے بھی ہیں جن سے اقوام و ممالک کی تقدیریں بدل گئیں۔ لیکن آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل سرزمین کربلا میں حق و باطل کے درمیان جو مقابلہ ہوا۔ تاریخ اس کا اپنا ایک جواب پیش نہ کر سکی۔ اس لڑائی میں حضرت حسین شہید ہو گئے لیکن فتح یزید کی نہیں ہوئی۔ حضرت حسین کا قتل یزید کی موت بن گیا۔ مدنی اور اندھیرے، نیکی اور بدی کی اس لڑائی میں یزید کی شکست ہوئی۔ اسلام کربلا کے بعد زندہ ہوا اور آج دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب ہے جس کے پیرو کر دلوں کی تعداد میں دنیا کے ہر ملک، ہر گوشہ ہر خطہ میں موجود ہیں۔

جس پیام کو یزید نے دبانا اور تباہ کرنا چاہا اس کے لئے حضرت حسین نے کربلا میں خود شہید ہو کر شکست دی۔ راہِ خدا میں ایثار و قربانی کا یہ واقعہ رستی دنیا تک امر رہے گا۔ اور موجودہ و آنے والی نسلوں کو بتلاتا رہے گا کہ دنیا میں نیکی اور سچائی کے لئے ایثار و قربانی ضروری ہے۔

کربلا کا واقعہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ دنیا کا ایک بڑا واقعہ ہے اور مسلمانوں کے لئے درس عبرت بھی کہ سچائی اور نیکی کے راستوں پر چلیں۔ اور اپنے رہنماؤں کے نقش قدم تلاش کریں۔ پھر اسوہ حسنہ و اسوہ حسینی اختیار کریں۔ بخلاف اس کے یزید کا رد (۲۵۷۷) تاریخ اسلام میں مترادف شقاوت و خسراں۔ حد یہ ہے کہ لفظ یزید داخلہ و شتام ہو گیا۔

حضرت حسین عالم مقام کا نام اور پیام صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ ان تمام انسانوں کے لئے ایک نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے جو حق و صداقت کی حمایت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جوں جوں شعور بیدار ہوتا جائے گا حسین نزدیک آتے جائیں گے۔ بلکہ ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین!

کتابیات :-

قرآن مجید۔ صحاح ستہ و دیگر کتب حدیث۔ تاریخ طبری حصہ اول، عقد الفرید، الامامہ و السائبہ۔ ترجمہ تاریخ الحنین مطبوعہ تہرہ۔ تہرہ الحسین مطبوعہ بغداد۔ تاریخ کبیر، شرح ہمزہ، تاریخ الخلفاء، سیوطی، تحفۃ اثناعشری، تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم، سیرۃ النبی جلد اول، سیر الصحابہ جلد ششم، سیر الشہداء و الثین، نگار لکھنؤ ۵۹ء شہید اعظم مولفہ مولانا آزاد۔ نگار لکھنؤ نومبر ۵۵ء، ماہنامہ ارشاد حیدر آباد، آستانہ دہلی اکتوبر ۵۲ء تقریر مولانا مزدوری دعوت دہلی مطبوعہ۔

باب الانتقاد

اے میری قوم! کیا تجھے شاعرِ مخمور سجد

پروفیسر کرامت علی کرامت

مخمور سعیدی جن کا مجموعہ کلام ”گفتنی“ میرے سامنے ہے، اردو کے صرف جدید شاعر نہیں بلکہ رومانوی شاعر بھی ہیں۔ ”رومانیت“ سے میری مراد ایک ایسی نفسیاتی تحریک ہے جو شاعر کی توجہ کو خارجی دنیا سے زیادہ اس کی داخلی دنیا پر مرکوز کرتی ہے اور شاعر کے ذہن و شعور کو فطرت کے بے ربط، پُر اسرار، غیر متعین اور لامتناہی پہلو سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رومانیت پسند شاعر فطرت کو تصنع کے مقابل میں، دل کو عقل کے مقابل میں اور تصورات کو عالم موجودات کے مقابل میں بلند مقام عطا کرتا ہے۔ یہ رومانوی تحریک تقریباً ہر زمانے کے شعراء میں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے اور اسی صدی میں ایک باقاعدہ تاریخی تحریک کی شکل اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بقول بدھ دیو بسو (بنگالی شاعر) یہ تاریخی تحریک ”بین الاقوامی ادب کے لئے ایک اہم واقعہ ہے جس نے اس کے بعد کے تقریباً تمام شعراء کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ آج کے جدید ادب کو بلا تامل رومانوی ادب کہا جاسکتا ہے۔ بدھ دیو بسو کا خیال ہے کہ جہاں ایلٹ اور دایری نے کلاسیکل زبان کے استعمال کی کوشش کی ہے وہیں ان کے کلام میں رومانیت نے سر اُبلد ہے۔ اسی طرح جس وقت مخمور اپنی جالیانی نظموں میں ردائی بجز و اوزان یا شعری مفردات کا استعمال کرتے ہیں تو اس وقت ان کے کلام میں کلاسیکیت کا اثر پایا جانا فطری بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے طرز فکر و انداز بیان دونوں میں رومانیت پسندی کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے جو کہیں بہت گہرا ہے اور کہیں ہلکا۔ مخمور سعیدی کی نظم ”اجنبی رات“ لیجئے۔ اس کا آخری شعر ہے:-

افراطِ رنگ و نور سے گھبرا رہا ہوں میں
کچھ اجنبی سا خود کو یہاں پارہا ہوں میں

اس شعر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موجودہ تہذیب کے تصنع سے یو کھلا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر واقعیت پسندی کے خارزار سے دور بھاگنا چاہتا ہے اور یہی چیز نظم کے مجموعی تاثر میں رومانیت کا عنصر پیدا کر دیتی ہے۔

نظم ”تعارف“ میں رومانیت اور واقعیت کا متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ”رومانیت“ کی نرمی اور ”واقعیت“ کی کڑھائی کو بیک وقت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بربطِ دوشس کا میں نغمہ سرشار بھی ہوں
سازِ امروز کی اک آہنی جھنکار بھی ہوں
شلیخ گل کی بھی پچک ہو میری فطرت میں مگر
وقت کے ہاتھ میں چلتی ہوئی تلوار بھی ہوں

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، مخمور سعیدی صحیح معنوں میں اردو کے جدید شاعر ہیں، کیونکہ ان کے طرز فکر و انداز بیان دونوں میں موجودہ طرزِ دہشت کی پیچیدگیوں کی ترجمانی ہوئی ہے۔ مخمور اس اعتبار سے بھی اردو کے جدید شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنی نظموں میں محض صنعتِ غزل کی فرسودہ علامتوں کے استعمال کی بجائے اپنی زندگی کے متنوع تجربات سے نئی نئی علامتیں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں الفاظ کا انتخاب اور رکھ رکھاؤ کچھ اس طرح نیچے تلے طریقہ پر ہوتا ہے کہ اکثر ان میں اجنبیت کا احساس تک نہیں گذرتا۔ فحس کی بابت مخمور کا رویہ بہت محتاط ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں خیالات و جذبات کا تسلسل و ارتقائے ان نظموں کو کامیاب شاعری کا لقب عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ یوں تو مخمور سعیدی نے متعدد ”مقصودی نظمیں“ بھی کہی ہیں لیکن ان کی

وہ نظمیں جن میں "خالص شاعری" کی جعلی پائی جاتی ہے، فنی اعتبار سے ان مقصدی نظموں کے مقابل میں بہتر ہیں۔ "خالص شاعری" سے مراد ایک ایسی شاعری ہے جس میں کسی نظریہ کا اظہار مقصود نہ ہو، بلکہ جو شاعر کے خالص جذبات کی آئینہ دار ہو۔ ان کی نظمیں "ایک تبسم" ایک کرن"۔ "شام"۔ "ورود"۔ "نیم شب"۔ "یادوں کا وطن" وغیرہ خالص شاعری کی ایسی مثالیں ہیں جن میں اسلوب کا نیا پن ہمیں بیک نظر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہائی دہے حسی کے عالم کی منظر کشی میں مخمور سعیدی کو کافی عبور حاصل ہے۔ اس بے حسی کے احساس کے پس پردہ غالباً روح عصر کا جذبہ کار فرما ہے۔ لیکن تقریباً ان تمام نظموں میں شاعر کو تہائی اور بے حسی میں سے اچانک امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اس طرح ان نظموں کے مجموعی تاثر میں قنوطیت کی بجائے رجائیت پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر کو موجودہ زندگی کی بے حسی کا احساس ضرور ہے۔ لیکن وہ اس کے پس پردہ ایک نئے کامیاب نظام حیات کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مخمور سعیدی کے کلام میں علامت پسندی کا ہلکا ہلکا پر تو ضرور نظر آتا ہے (جسے بلفظ دیگر "اشاریت" بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن وہ ملاست پسندی کے عوض میں "ابلاغ" کا دامن مجروح ہونے نہیں دیتے۔ ان کو اس امر کا احساس ہے کہ شاعری کی قدریں محض اس کی تخلیق پر منحصر نہیں بلکہ اس کی تخلیق ثانی (Recreation) پر بھی منحصر ہیں جو قارئین کے ذہن میں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں عقل و ادراک شاعرانہ تجربات کی مشاطگی میں اہم حصہ ضرور لیتے ہیں، لیکن شعری تخلیق کے دوران نہ ان کی کوئی خاص اہمیت ہوتی ہے اور نہ قاری کے ذہن میں تخلیق ثانی کے دوران انبساط کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے مخمور سعیدی کے کلام میں شاعرانہ جذبات کے ساتھ بیدل، غالب، یامون جیسی دقیق معنی آفرینی وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ ان کی شاعری میں انبساط کا پہلو اس نازک ذہنی عمل سے تعلق رکھتا ہے جو بقول ورد زور تھ کسی زبردست یا تند رد عمل کے بغیر بھی متحرک ہو سکتا ہے۔

مخمور سعیدی فکر و نظر کی آزادی کے بڑے علم بردار ہیں، وہ اپنے ضمیر کے خلاف کسی بھی "نظام جبر کا مدح خواں" بننا نہیں چاہتے، کیونکہ انہیں اپنے نطق کی توہین منظور نہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں:-

ہر اس نظام سے لیکن ستیرہ کار ہوں میں جو مجھ سے چھین لے فکر و نظر کی آزادی

مخمور کے خیال میں "کیونزم عوام کو اقتصادی طور پر بلند تو کر سکتی ہے، لیکن روحانی طور پر بلند نہیں کر سکتی۔ چنانچہ عوام کی نمائندگی کا دعوے کرتے ہوئے بھی کیونزم "قلب عوام کی دھڑکن" کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔ غالباً ابتر کامیو کی طرح مخمور کا بھی عقیدہ ہے کہ مجموعی طرزِ نظر ان کے دردِ دل کا درماں نہیں بن سکتی، بلکہ آدمی کو انفرادی طور پر "آدمی" کی حیثیت سے پہچان کر اس کی خدمت کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ قلب عوام کی دھڑکن کو پہچاننے کے لئے انفرادی طرزِ نظر ہی مدد کر سکتی ہے جو کیونزم کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ کیونزم سے ناآسودگی کے ساتھ ساتھ مخمور قلب عوام کی دھڑکن میں وہ قوت محسوس کرتے ہیں جو ایک اور نا دیدہ انقلاب دامن میں لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

رکی نہیں ابھی "قلب عوام کی دھڑکن ابھی کچھ آگ بجھی راکھ میں بھی باقی ہے

مخمور سعیدی کے نظریہ حیات کا صرف سماجی پہلو ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا روحانی پہلو بھی ہے کیونکہ ان کو اس امر کا احساس ہے کہ شاعر کی ہستی کے باہر جس طرح ایک کائنات موجود ہے اس کے اندر بھی اسی طرح ایک کائنات پوشیدہ ہے، اور ان دونوں کی ہم آہنگی ہی شاعر کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے بقول دوستوؤسکی "کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں دھڑکنوں میں بے گیا ہوں؟..... جیسے کسی شخص کی دوسری خودی اس کے ہمدوش استاد ہو۔ جیسے وہ شخص خودی ہوش دزدی عقل ہو جبکہ اس کی دوسری خودی غیر شعوری طور پر کام کر رہی ہو" یہاں دوستوؤسکی نے دوسری خودی سے مراد شاعر کی داخلی کائنات لی ہے۔ الغرض یہ دوسری خودی روحانیت کی علمبردار ہے جو عقل کی بجائے دل کو اور جرد کی بجائے جنون کو اپنی مشعل راہ تصور کرتی ہے۔

مخمور سعیدی کو اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ تہذیب جو "امن" کے پردے میں نسلِ آدم کو مٹا دینے کی تیاریاں کر رہی ہے، اس کی

تجدید کے لئے شمع خشق کو ہی فردزاں کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ”نئی روشنی“ کی چکاچوند میں قلب و نظر کی تشنگی بجھ نہیں سکتی: اس لئے شاعر نظم ”دیوالی“ میں اُجالوں کے ابدی اور مابعد الطبیعی پہلو کو ڈھونڈ کر نکالتا ہے۔

قدم قدم پہ جو روشن ہیں یہ دیئے ان سے فقط نگاہ ہی کیوں اکتساب نور کرے
جو کر سکیں تو انہیں کیوں نہ ہم عطا کر دیں وہ روشنی جو تکرار دلوں کا دودھ کرے
دلوں کے اس تکرار کو دور کرنے پر ہی مستقبل بعید تک کرۂ ارمن میں نسل انسان کے زندہ رہنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے جن میں وہ حال کے تجربات سے مستقبل کا گیسو سنوارنا چاہتے ہیں۔

(۱) حسن خود ہی رُخ فردا کا نکھر آئے گا
(۲) زندگانی کے سادہ خاکے پر
اک دل افروز لمحہ گزراں
(۳) آتش کدہ یقین کی لو سے
امروز کی تیرگی میں گویا
کا کل لیلیٰ امروز سنور جانے دو
تو بہ نورنگ اُبھار جاتا ہے
کتنے لمحے سنوار جاتا ہے
یوں قلب و جگر گھٹل رہے ہیں
فردا کے چراغ جل رہے ہیں
غرض کہ مخمور سعیدی نے اپنے کلام میں جا بجا ”وقت“ کے عنصر کو اپنے جذبات کے پُر خلوص اظہار کے لئے تشبیہ، استعارات اور ذہنی پیکر کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مخمور کے کلام میں ”وقت“ کے عنصر کا جس قدر متنوع استعمال ہوا ہے، جدید اردو شاعری میں بہت کم کہیں اور نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وقت کا احساس شاعر کے تحت الشعور اور لا شعور میں پرج بس گیا ہے اور اس کی طرز فکر و نظر کو اس احساس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ وہ ”وقت“ کے عنصر کو محض استعاروں کا ظاہری حسن بڑھانے کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے جذبات کے پُر خلوص اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں جو کم از کم شاعری کے بہت ضروری ہے۔

مقامی تہذیبی روایات کا عنصر بھی مخمور سعیدی کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ اپنے کلام میں جہاں وہ قرآن سے تلمیحات استعمال کرتے ہیں، وہیں رامائن، مہا بھارت وغیرہ سے بھی تلمیحات قبول کرتے ہیں۔ نظم ”حریت فکر“ میں فکر کی آزادی سے متعلق کہتے ہیں۔

گلزارِ ابراہیم کے پھولوں کا تبسم
پہنانہ سکا کنس جسے طوق اجل کا
آئینہ خورشید میں عکس رُخ ذرات
خرد دلِ نرود میں شعلوں کا تلاطم
وہ کرشن کی مری کا لہکتا ہوا نغمہ
گوتم کا، مہادیر کا پیغام مساوات
اُسی طرح نظم ”جنون و خرد“ سے ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خرد راون کا عزم فاسقانہ
خرد ہے کنس کا خونیں ترانہ
خرد نرود کا زعم شہانہ
جنوں پاکیزگی رآم و سیتا،
جنوں ہے کرشن کی مری کا نغمہ
جنوں خود اعتمادی براہیم
نظم ”امن باز“ سے ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں جن میں شاعر نے ان امن بازوں پر تنقید کی ہے جو درحقیقت غارِ مکران میں عالم ہیں۔

ان کی نظروں میں زلیخا کی محبت کچھ نہیں
اجنبی ان کی زبانوں کے لئے سیتا کا نام
ان کے بازوؤں میں خود یوسف کی قیمت کچھ نہیں
ان کے کالوں تک نہیں پہنچی کسی آوازِ رام

جلنے کتنے چمن ان کے جبر کے محکوم ہیں جانے قربِ رام سے کتنے بھرت محروم ہیں
محمور سعیدی نے جنتِ نظارہ کشمیر کی جھیلوں چشموں اور ندیوں سے لطف و حظ اٹھاتے ہوئے ان کا نگار اپنی شاعری میں سمونے
کی کوشش کی ہے۔ "اے وادی کشمیر" سے ذیل کا بند ملاحظہ ہو جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمور کشمیر کی سرزمین سے کس قدر وابہانہ لگاؤ رکھتے
ہیں:-

ہر خار ترا روکشِ صد سر و سمن ہے
ہر پھول ترا غیرتِ گلزارِ عدن ہے
تو خلد کے خورشیدِ لطافت کی کرن ہے

یا وادیِ امین سے چرائی ہوئی تنویر

اے وادی کشمیر

نظم "چھبیس جنوری" میں شاعر چاہتا ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں ایک دوسرے کے کچر کا احترام کریں تاکہ باہمی خوشگوار تعلقات قائم
ہو سکیں۔ اس بات کو استعاراً انہوں نے یوں کہا ہے:-

چلی ہے پھر ربطِ باہمی کی دہی ہوائے حیات پرور جو کوثر و گنگ کو بہا کر پیر ایک سنگم پہ لارہی ہے
شاعر نے ۱۹۵۷ء کے مجاہدینِ آزادی کے حضور میں (جن میں خود شاعر کے پردادا بھی شامل تھے) نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے
فرمایا ہے:-

نئی سحر کی شفق رنگِ روشنی بن کر، سوا دِ شام کو گلزار کر دیا تم نے
بجھا کے خون کے چھینٹوں سے شعلہ امروز گلوں سے دامنِ فردا کو بھر دیا تم نے

الغرض محمور سعیدی کا کلام ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی روایات کی کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے جس کے انفاس کی خوشبو
سے مشامِ روح معطر ہو جاتی ہے۔

محمور سعیدی نے اپنی بعض نظموں میں ممکنہ کے جو تجربے کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علامت پسندی سے متاثر ہندو نظریات آتے ہیں
لیکن اپنے کلام میں ابہام کے قائل نہیں ہیں۔ وہ روایتی علامتوں سے ہٹ کر اگر ذہنی پیکر استعمال کرتے ہیں تو ان میں جذبات کے ابلاغ کا خاص
خیال رکھتے ہیں۔ اس لئے عموماً ان کی نئی نئی علامتیں بھی شعریت سے خالی نہیں ہوتیں۔ محمور نے ذہنی پیکر کے سلسلے میں طرح طرح کے تجربے کئے ہیں۔
ان کی نظمیں "ایک پرانا شہر"، "نوید" وغیرہ میں پیکری (IMAGIST) شاعری کا پر تو ملتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، محمور کے ذہنی پیکر
میں عموماً تازگی، شدت اور قوتِ ابلاغ تینوں عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ان عناصر کے علاوہ ان نظموں میں خیالات اور جذبات کا بہت ہی خوبصورت
ارتقاء نظر آتا ہے جو ذوقِ سلیم کو بہ یک نظر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

نظم "ایک پرانا شہر" لیجئے۔ اس نظم کی موسیقی کا اس کے مجموعی تاثرات اور موضوعِ سخن کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔

محمور کی ایک اور تجرباتی نظم "نوید" لیجئے۔ یوں تو پوری نظم بظاہر پرندوں سے متعلق ہے لیکن اس نظم کو ایک کامیاب علامت پسند نظم بھی
کہا جاسکتا ہے جو شاعر کے سماجی اور سیاسی شعور پر روشنی ڈالتی ہے۔ "نتھانٹا پرندہ" جو چمن میں بہار کی دعوت دے رہا ہے خود "شاعر" ہو سکتا ہے۔
یہ بدلتے موسم کا خوشنوا معنی پرانے درخت کے نودمیدہ پتوں میں چھپا ہوا چھپا رہا ہے اور جشنِ نوروز کا ترانہ سن رہا ہے۔ ٹھٹھری ہوئی بے برگ و بار
ڈالیوں میں قرینہ برگ و بار پاکر وہ پرندہ شگفتہ لمحوں کی تلیوں کو چمن میں واپس بلا رہا ہے۔ وہ پرندہ ہمیشہ یہ گیت گارہا ہے کہ اے چمن سے نکلی ہوئی
بہار وائے تم کب تک اس طرح خانہ بدوش پھر دو گی ادویوں ہی برف پوش رہو گی۔ منو کی دنیا نظر میں لئے پلٹ آؤ۔ کیونکہ خزاں کا عفریت مرجھا ہے اور بہاری

خانہ بدوشیوں کا اُجاڑ موسم گذر چکا ہے۔ اس نظم میں جو علامتیں مستعمل ہوئی ہیں ان میں تازگی و شگفتگی پائی جاتی ہے پرندوں سے متعلق اس طرح کی علامتی نقلیں غالباً اردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔
محمور سعیدی کا یہ شعر لیجئے:

چھائے ہوئے ہیں تیرگی شام، سحر پر
اپنی نوائے درد کی تابندگی سے ہم

یہاں شاعر نے SYNESTHESIA کا تجربہ کیا ہے جس میں آواز اور روشنی ان دونوں دو مختلف کیفیتوں کو بیک وقت یکجا پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ایک طرح کے حس سے وابستہ ذہنی پیکر کو دوسری طرح کے حس سے وابستہ ذہنی پیکر کے ساتھ ملا دینے کی وجہ سے ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا ذہن و شعور نئی قسم کے جذباتی تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔

کسی شاعر کے کلام میں غزل و نظم دونوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا فطری ہو جانے پر بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ مؤثرات بہت واضح ہوں کیونکہ صنف غزل کے آداب روایات اور مزاج ذہن شاعر کو ایک خاص سمت موڑ دیتے ہیں جس سے شاعر کو صنف نظم کی سی آزادی نہیں ملتی۔ غالباً ہی سبب ہے کہ محمور سعیدی نے جہاں اپنی نظموں میں نئے نئے ذہنی پیکروں کے ایجاد میں فنکارانہ ہنرمندی و چابکدستی دکھائی ہے وہیں ان کی غزلوں میں اس قدر چوٹ کا دینے والے جدید ذہنی پیکر بہت کم نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی غزلوں کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں اکثر جگہ نفسیاتی تجربہ اور ولادت قلبی کی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے، نتیجتاً تاثر کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی پائی جاتی ہے جو ان اشعار کو کامیاب شاعری کے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان کی شانِ تغزل کی چند مثالیں درج ذیل ہیں جن میں واردات قلبی کو شعری پیکر میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے اور جن میں تلذذ، توانائی اور بے ساختگی خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

اب اہل عشق کی دل بستگی کہاں ممکن؟ کہ کھو رہا ہے ترا غم بھی دلکشی اے دوست!

مجھ کو تنہا جو سرِ جادۂ غم پاتی ہے ہم سفر بن کے تری یاد چلی آتی ہے

روشن کیے ہوئے ہیں شبستانِ آرزو اے شمع انتظار تری روشنی سے ہم

بیزار ہے دل اب کیوں ہر عشرتِ جہاں ہے ہوتی ہے ترے غم کی کیا ابتدا یہاں سے؟

یہ کس خیال نے کی ہے مری زباں بندی تجھی سے کہنے کی باتیں تجھی سے کہہ نہ سکوں

کیا قیامت ہو کہ دل سے مرے بیگانہ صفت قافلے اب تری یادوں کے گذر جاتے ہیں

یہ سکوتِ شب تنہائی یہ محویتِ شوق دل کی دھڑکن تری آواز ہوئی جاتی ہو

شمع جنوں جلاؤ کہ راہِ حیات پر اب گمراہانِ عشق کو کچھ سوچتا نہیں

خمریات کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے:-

اور بھی تیز خور اگوششِ جام اور بھی تیز اس قدر تیز کہ رک جائے زمانہ ساقی

یہ شعر مجاز کے اس رندانہ شعر کی یاد تازہ کر دیتا ہے:-

مجھے پینے دے، پینے دے کہ ترے جامِ لعلیں میں ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

دونوں شعرا سے تقریباً ایک ہی قسم کا لامبالی پن ظاہر ہوتا ہے۔

محمور سعیدی کے مجموعہ کلام "گفتنی" میں بعض کمزوریاں بھی ہیں! انہیں درج ذیل کر رہا ہوں۔ ویسے یہ غلطیاں ایسی نہیں ہیں جو معمولی سی کاوش میں دور نہ ہو سکیں۔

(۱) دور اور پاس اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہ ہو ظلمت آلود نظاروں کے سوا کچھ بھی نہ ہو (نظم - درو) یہاں "اندھیروں" اور "نظاروں" کو ہم قافیہ الفاظ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے جو غلط ہے۔

(۲) کتنی مانگیں صندل دسیندور اپنا کھو چکیں

یہاں "صندل" عربی لفظ ہے اور "سیندور" ہندی لفظ۔ اس لئے واؤ عطف کا استعمال غلط ہے۔

(۳) انہیں میں جنت تسکین چشم و دل گم ہے تجلیوں کے تری یہ طلسم گونا گوں

دوسرے مصرع میں تعقید کا نمایاں عیب پایا جاتا ہے۔

(۴) منزلیں عشق کی دشوار بھی ہیں سخت بھی ہیں تو مسافر ہے تو پتھر کا جگر پیدا کر

یہاں "دشوار" اور "سخت" دو ہم معنی الفاظ مستعمل ہوئے ہیں جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ "دشوار بھی" سخت بھی " میں " بھی " کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۵) میں کہ دنیا کی پذیرائی سے محروم مرے تم سے منسوب سب امکان پذیرائی کے

یہاں تعقید کی خامی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اس شعر کو پڑھتے وقت رکاوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔

(۶) ہر قدم پر مرے سجدوں کی پنہ گاہیں تھیں ان گنت بت تھے تصور کے صنم خانوں میں

آرزو چھوڑ چکی تھی تری محفل کا خیال شوق آسودہ تھا ابجان شبستانوں میں (نظم - اعتراف)

چونکہ صنم خانہ اور شبستاں ہم قافیہ الفاظ نہیں ہیں اس لئے "صنم خانوں" اور "شبستانوں" کو ہم قافیہ الفاظ کی حیثیت سے استعمال کرنا اساتذہ کے نزدیک جائز نہیں۔ مندرجہ بالا بند میں ان قافیوں کا استعمال نہ ہوتا تو بہتر تھا۔

غرض کہ مخمور سعیدی اردو کے ایک ایسے ہونہار نو جوان شاعر ہیں جو فطری تقاضے پر اپنی نظموں میں بہت ہی کامیاب تجربے کر رہے ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی علامت پسند اور پیکری شاعری میں بھی "ابلاغ" کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی نظمیں، سیاسی نظموں کی پسنبت زیادہ کامیاب ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں بہت ہی خوبصورت ملزومات خارجیہ (Objective Correlatives) کا استعمال ہوتا ہے۔

تین اہم کتابیں

تدریس اردو

اردو تدریس پر فرمان فیمپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ قیمت .. چار روپے

اردو رباعی

فرمان فیمپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رباعی کے فن، موضوع، اور ارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت .. پانچ روپے

تحقیق و تنقید

تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس میں فرمان فیمپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ قیمت .. تین روپے

باب المراسلہ

غلام جیلانی برقی :-

برادر عزیز و مکرم اسلام علیکم
کراچی جناح سنٹرل ہاسپٹل کے کمانڈنگ آفیسر کرنل خواجہ عبدالرشید میرے احباب میں سے ہیں۔ انہوں نے ۲۸ جنوری کے "جنگ" کا ایک تراشہ مجھے بھیجا اور میں سوچنے لگا۔ سو کیا نیا زہاب نے یہ خط لکھنؤ سے لکھا ہے؟ ضرورت کیا پیش آئی تھی؟ میں نے فوراً ایک "جواب غزل" جنگ راولپنڈی کو بھیج دیا۔ جس کی نقل شامل مکتوب ہے۔

پرسوں گھر کے ایک بزرگ نے دسمبر ۱۹۶۳ء کا "نگار" مجھے بھتا دیا۔ اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آپ "دارالحرب" سے دارالسلام والا سلام "میں آچکے ہیں۔

گزشتہ سترہ برس میں "نگار" کے صرف دو تین پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور میں قطعاً اندازہ نہ کر سکا کہ آپ "فکر و دانش" کی کس منزل پر ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں "ادارہ فکر و نظر سے خطاب" پڑھا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کا مہیّب علم اور گلبار و شعلہ بار قلم ابھی تک "ملائیئت کی دھجیاں اڑانے میں مصروف ہے" ("چند لطائف ص ۵-۶) تسلیم۔ کہ "بنائے کہنہ" کو آباد کرنے سے پہلے دیران کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر آپ جیسے حکیم و دانشور کی ساری زندگی تخریب ہی میں کٹ گئی، تو تعمیر کون کرے گا اور اس کی صورت کیا ہوگی؟

یہ فراموش نہ فرمائیے گا کہ آپ کراچی میں ہیں، جہاں :-

- ۱۔ اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری شباب پر ہے۔
 - ۲۔ جہاں دافرد دولت سیل شراب بن کر تمام روحانی و اخلاقی اقدار کو بہائے لئے جا رہی ہے۔
 - ۳۔ جہاں حسن کو محفل رقص و شہستان عیش کی زینت بنایا جا رہا ہے۔
 - ۴۔ جہاں فکر و فلسفہ کا خوفناک قحط ہے۔
 - ۵۔ اور جہاں ایک ابھی ایسا دل جلا موجود نہیں۔ جس کی چیخ دلوں کو چیر کر نکل جائے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کا بالطرب کائنات سے دوبارہ قائم کرے۔
- پاکستان میں اسلام حسین سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ آج زندگی کے متعلق قرآن کے عظیم اذکار

نگاہ سے ادھل ہو چکے ہیں اور وہ انسان جس کی آخری منزل دہلیزِ یزدان تھی آج زر، زن اور مے کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ نگار اسلامی (قرآنی) اقدار کی تبلیغ کے لئے وقف ہو جائے۔ اور آپ باقی ماندہ ایامِ شراہیوں، رقاصوں اور اوباشوں کے خلاف جہاد کرنے میں صرف فرمائیں۔ کراچی وہ واحد شہر ہے، جہاں لڑکیاں برہنہ ناچ کرتی ہیں میرے ایک دوست ۵ جنوری ۱۹۶۴ء کو ایک ایسی محفل میں شریک ہو چکے ہیں۔

قرآن اور تاریخ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ آسودہ حال طبقے کی عیاشی کو کبھی معاف نہیں کرتا، اور انھیں سزا دینے کے لئے ہلاکو، تیمور، نادر اور نلوہ جیسے خونخواروں کو جنم دیتا ہے۔ کراچی کو بھارتی دزدوں سے بچائیے۔ اور ان کے سینوں میں عشقِ دایمان کے چراغ پھر روشن کیجئے۔

میں اور علامہ نیاز فتحپوری

۲۸ جنوری ۱۹۶۴ء کے "جنگ میں علامہ نیاز نے" میں اور غلام جیلانی برق کے عنوان سے دو مکتوب شائع فرمائے ہیں ایک وہ گستاخانہ خط جو میں نے انھیں لکھا تھا اور دوسرا اس کا جواب۔ یہ واقعہ ۱۹۶۴ء کا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی منہج فکر میں اقبال اور مشرقی رحمۃ اللہ علیہم کی وجہ سے شدید زلزلے اٹھ رہے تھے۔ اگر کوئی کسر تھی وہ علامہ نیاز پوری کر رہے تھے۔ نیاز غیر قرآنی عقائد و وضعی روایاتِ اسلامی اور مذہبی رسوم اور شعائر کے محلات پر بجلیاں برسارہا تھا لیکن جوشِ جہاد، میں بارہا حدود کو پھلانگ جاتا تھا۔ میرا وہ گستاخانہ خط اسی روش کے خلاف ایک ہلکا سا احتجاج تھا اس خط کے بعد میں اور نیاز ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے، میرے بڑے بھائی پر دھیس غلام ربانی عزیز نیاز صاحب کے بہت بڑے حامی ان کے فکر و فلسفہ کے پر جوش مبلغ تھے انھوں نے نیاز صاحب کو کیمبل پورا آنے کی دعوت دی انھوں نے دوری منزل اور مصروفیات کا عذر پیش کیا لیکن بھائی جان نے اس قدر اصرار کیا کہ وہ تشریف لے ہی آئے اور چار روز ہمارے ہاں رہے۔

یہ چار دن مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ صبح سے رات کے بارہ بجے تک طلباء اساتذہ دکلا اور دیگر اہل علم کا ایک ہجوم رہتا تھا، بخشیں چھڑتی تھیں۔ تاریخی، ثقافتی، مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ مسائل پر سوال و جواب ہوتے تھے۔ انھیں دنوں آپ نے طلباء کو کبھی خطاب فرمایا۔ اور درسِ ادب اگر بو ذمزمہ مجھے کے عنوان سے ایک خاصا طویل مقالہ پڑھا جو میرے پاس آج تک محفوظ ہے کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں نے اس حکیمانہ تحریر کو آج تک شائع کیوں نہیں کرایا۔ کوئی جواب ہو تو دوں۔

میں ۱۹۶۵ء سے تقسیم ملک تک "نگار" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نہ جانے آج کل نیاز صاحب فکر و دانش کی کس منزل پر ہیں عام مشاہدہ تو یہی ہے کہ عمرِ عزیز چالیس سے گزر جائے تو وجدان کی آنکھ کھل جاتی ہے یہ وہی آنکھ ہے جو کوہساروں کے بند دہشت سلسلوں اور ستاروں کی بکھری بکھری محفل میں رشتہ و وحدت دیکھ سکتی ہے اور حجابات کون دزماں کو چیر کر شاہد کائنات تک جا پہنچتی ہے۔ اتنا بڑا جینیس (نابغہ) اس عطیہ سے محروم رہے ناقابلِ تسلیم۔

اسلامی تاریخ فکر میں نیاز کو بہت بڑا مقام حاصل ہے آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی مورخ ہمارے فکر کی تاریخ لکھے

غزالی، رازی، رومی، ابن تیمیہ، محدث دہلوی، افغانی، سرسید اور اقبال کے فلسفے پر روشنی ڈالے۔ اور اسی سلسلے میں نیاز کا مقام بھی متعین کرے۔ یہ کون کرے گا اس کا جواب تقبل ہی دے سکتا ہے۔

(نگار)۔

محبتی - آپ کا خط اور تراشہ جنگ (راولپنڈی) دونوں شائع کر رہا ہوں وہ اس لئے کہ اس میں آپ نے بعض مفید مشورے مجھے دئے ہیں، اور یہ اس لئے کہ آپ نے اس میں مجھے میری زندگی کا عزیز ترین زمانہ یاد دلایا۔
کیمبل پور کے وہ چند دن میں کبھی نہیں بھول سکتا جب آپ جناب غلام ربانی عزیز جناب فضل حسین تبسم اور دیگر اساتذہ کالج کی مخلص صحبتیں مجھے حاصل تھیں اور اپنی یادہ گوئیوں کے لئے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا تھا
جب کیمبل پور سے لاہور پہنچا اور اختر شیرانی اور رفیع اجیری کی رنگین صحبتوں میں دو دن بسر کئے لیکن وہاں بھی کیمبل پور کو نہ بھلا سکا۔
یہاں تک کہ جب میں لکھنؤ لوٹا تو وہاں بھی آپ حضرات کے نقوش محبت عرصہ تک دل سے محو نہ ہو سکے۔ اس کے بعد آپ کے برادر معظم اور جناب تبسم تو مجھے کبھی کبھی یاد کرتے رہے، لیکن آپ نے بھلا دیا۔ اور وہ واقعہ جس کا ذکر میں نے "جنگ" میں کیا ہے، اسی "عہد فراموشکاری" سے متعلق تھا، اس طرح آخر کار میں نے آپ کو پھر پایا۔
اس میں شک نہیں ہمارا موجودہ معاشرہ بڑے دردناک دور سے گزر رہا ہے لیکن اس کے اصلاح کی کوئی صورت میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ میرا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا، آپ بھی سن لیجئے :-

بہت سعی کیجئے تو مر رہے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

مصحفی نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزلگوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

قیمت :- تین روپے۔

منیجر۔ نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

باب الاستفسار

(روح و عالم برزخ)

پروفیسر سعیدہ عروج منظر

مکرمی نیاز صاحب

نگار پڑھتی ہوں، اس وقت بھی پڑھتی تھی جب بھارت سے شائع ہوتا تھا، اور اب بھی پڑھتی ہوں جب آپ اس کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئے۔ روح کے بارے میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔ روح کے بارے میں عام عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک خاص مقام پر قیامت تک رہتی ہے۔ جسکو برزخ کہتے ہیں مختلف مذاہب نے اس خیال کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تقریباً تمام مذاہب نے کسی ایسی جگہ کا ہونا تسلیم کیا ہے جہاں مرنے کے بعد روحوں کو عذاب و ثواب اور نیک اعمال کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ انتظار بھی اعمال کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح عذاب و ثواب سے متعلق ہوتا ہے۔ نگار مختلف استفسارات کا جواب دیتا رہتا ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ آپ سے استفسار کروں اور مجھے روح اور برزخ کے بارے میں آپ سے کچھ رہنمائی ملے کہ اس عقیدہ کی اصلیت کیا ہے؟

(نگار) روح کے بقا کا خیال نہایت قدیم ہے حتیٰ کہ "اخلاقی مذاہب" کے وجود سے پہلے انسان اپنے عہد وحشت و بربریت میں بھی یہی یقین رکھتا تھا کہ موت کے بعد نہ صرف روح باقی رہتی ہے بلکہ اپنے پس ماندگان سے واسطہ رکھتی ہے اور اس عقیدہ کا سبب جذبہ محبت تھا یا جذبہ خوف و احترام۔ یعنی اگر کوئی عزیز و محبوب ہستی اٹھ جاتی تھی تو ان کا جذبہ محبت مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو موجودہ مان کر اپنی تسلی و تسکین کر لیں اور اگر کوئی صاحب اثر و اقتدار ہستی اٹھ جاتی تھی تو ان کا "جذبہ خوف و احترام" مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو بدستور موجود مانیں۔ بعد کو جب "مذاہب اخلاقی" کی بنیاد پڑی، تو ان میں بھی بقا، روح کا خیال بدستور قائم رکھا گیا۔ کیونکہ عوام کے درستی اخلاق کا بہت کچھ انحصار اعتقاد معاد پر ہے اور معاد کے لئے بقا، روح کا اعتقاد ضروری ہے ورنہ عذاب و ثواب کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ پھر چونکہ عذاب و ثواب کے لئے عوام کو سمجھانے کے لئے بالکل ایک دنیاوی بادشاہ یا حاکم کے فیصلہ و حکم کی طرح ایک عدالت گاہ کا ثابت کرنا بھی ضروری تھا اس لئے بعض مذاہب میں قیامت، یوم آخرہ اور بعث و حشر کا خیال پیدا کیا گیا۔ یعنی اس دن کا جب تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور خدا کے سامنے محاسبہ اعمال ہو کر سزا و جزا کی تعیین کی جائے گی

اور بعض مذاہب نے "من مات فقد قامت قیامتہ" کے اصول پر یہ بتایا کہ مرنے کے بعد ہی ہر شخص کا فیصلہ ہو جائے گا اور قیامت کبریٰ کے عقیدہ سے گفتگو نہیں کی۔

پھر چونکہ عقیدہ اول کے مطابق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل اور مرنے کے بعد جو زمانہ ایک انسانی روح پر بسر ہوتا ہے وہ کس طرز شمار ہوگا اور اس کو کیا کہیں گے اس لئے اس خدشہ کے جواب میں ایک نئی چیز یعنی عالم برزخ کا خیال پیش کیا گیا اور اس کی مختلف صورتیں مختلف مذاہب میں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم مختصراً تمام اہم مذاہب کے اعتقادات اس باب میں درج کئے دیتے ہیں۔

قدیم ایرانی عقیدہ | پیردانِ زردشت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کی روح کو ایک پل پر سے لے جاتے ہیں جو کوہ البرز اور چکات دایتہ کے درمیان واقع ہے۔ جب روح اس پل کو عبور کر جاتی ہے تو اس کے اعمال بد و نیک کا حساب مترا، رشنو، اور سردش کے سامنے ہوتا ہے۔ اگر اس شخص کے اعمال نیک اس کے اعمال بد سے زیادہ ہیں تو اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر اس کے اعمال بد نیک سے زیادہ ہوتے ہیں تو اسے دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس کے اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو اس کو "ویداتی" (آخری فیصلہ) کے دن تک جو جنگ ہو رہا مردہ اور امرن کے خاتمہ کے بعد ہوگا ٹھہرنا پڑے گا۔ جس مقام میں ایسی ارداح آخری فیصلے کے لئے ٹھہریں گی اسے "مسوانوگانوس" کہتے ہیں (ملاحظہ ہو دیداد باب ۱۱۱ کا کھٹا ۳۶۔ نیز لیت باب ۱۱۱ کا کھٹا ۳۰۔ باب ۱۱۱ کا کھٹا ۳۰)۔

گویا "مسوانوگانوس" قدیم ایرانیوں کا برزخ ہوا۔ جہاں روح کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اس تزکیہ و تہذیب کے بارہ درجے ہیں۔ روح مذکوران مدارج سے گزر کر پوری طرح پاک و صاف ہو جاتی ہے اور اس قابل ہوتی ہے کہ اسے ہو را مردہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ قدیم مصریوں میں تین نظریے تھے (۱) مردہ کی روح چڑیا بن کر فضا میں اڑ جاتی ہے (۲) مغرب کی طرف جا کر مردوں کی روحیں ٹھہریں لگا کر آسمان پر چڑھ جاتی ہیں۔ (۳) مردوں کی روحیں زیر زمین یعنی پاتال کو چلی جاتی ہیں۔ رات کے وقت پاتال میں روحوں کو بارہ گھنٹہ تک خداوند رع آفتاب کے درشن ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ مرنے والے کے دل کو دربارِ اوسیریز میں تین شخص ایک بہت بڑی اور نہایت صحیح ترازو میں تولتے ہیں۔ اس وقت یہاں تین محاسب ہوتے ہیں۔ (۱) اوسیریز (۲) انوبیس (۳) اور تھوتھ۔ ترازو کے ایک پلے میں دل اور دوسرے میں باٹ رکھے جاتے ہیں۔ پھر اگر مردہ کی نیکیاں زیادہ ہوتی ہیں تو اس کی روح کو ابدی مسرتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر بدیاں زیادہ ہوتی ہیں تو فوراً مگرچھ اس کی روح کو نگل جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ روح ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے اگر نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر ہوتی ہیں تو وہ روح تا فیصلہ اوسیریز ایک پرند بن جاتی ہے جسے "با" کہتے ہیں اور وہ

۱۔ کشمیری پنڈتوں میں یوم وفات سے بارہ دن بعد مردہ کی بارہویں کرائی جاتی ہے اور اس روح جس کی جو حیثیت ہوتی ہے دان پُن کر کے ایصالِ ثواب کرتا ہے۔ ممکن ہے زردشت کے بارہ درجوں سے ہندوؤں کے اس عقیدہ کا بھی کوئی تعلق ہو۔ ۲۔ عہد جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی خیال تھا کہ متول کی روح کا اگر قصاص نہیں لیا جاتا تو چڑیا بن کر فضا میں چھتی اور پھر پھڑپھڑاتی پھرتی ہے جس کی آوازیں بوقت شب سنائی دیتی ہیں۔ ۳۔ ممکن ہے یہ تعبیر ہو اس امر کی کہ جب نصف حصہ زمین پر بارہ گھنٹہ کے لئے تاریکی چھا جاتی ہے تو دوسرے نصف حصہ پر بارہ گھنٹہ تک آفتاب نظر آتا رہتا ہے۔ ۴۔ میزان کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔ ۵۔ مجوسوں کے یہاں بھی تین محاسب ہوتے ہیں (۱) مستر (۲) رشنو اور (۳) سردش۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں تین محاسب ہوتے ہیں (۱) میوس (۲) ربا و (۳) سینقوس اور (۳) ایاکس۔

چڑیا رات کے وقت قبرستانوں اور قبروں پر پھڑپھڑاتی ہے۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ | قدیم یونانیوں کے عقیدہ میں تمام کائنات تین حصوں میں منقسم تھی (۱) ملا را علی (۲) دنیا۔ (۳) اسفل السافلین۔ موخر الذکر مقام وہ ہے جہاں سب کی روحیں بعد از مرگ لے جانی جاتی ہیں اس مقام کو یونانی زبان میں "ہاڈس یا ہیڈس" (Hades) کہتے ہیں۔ یہاں جب روح پہنچتی ہے تو اس کے اعمال کا حساب کتاب تین دیوتا کرتے ہیں۔ (۱) مینوس (۲) رہا دانیٹھوس (۳) ایاکس۔ اگر وہ شخص نیکو کار ثابت ہوتا ہے تو اس کی روح کو بہشت "ایزیم" (Elysium) میں پہنچا دیتے ہیں اور وہ بدکار ہوتا ہے تو اس کی روح تارتارس (Tartarus) میں پہنچا دی جاتی ہے۔ جہاں اس پر عذاب ہوتا ہے اگر اس کے نیک و بد اعمال برابر ہوتے ہیں تو اس کی روح کو ہیڈس (Hades) میں تزکیہ اخلاق کے لئے تافیدہ پلوٹو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قدیم ہندوؤں کا خیال | ہندو سنان دھرم مذہب کے مطابق جب کوئی شخص مرتا ہے تو جبراج موکل آکر اس کی روح کو پاتال میں لے جاتا ہے۔ یہاں اس کے اعمال کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ تمام مردوں کی روحیں اسی مقام پاتال میں آخری فیصلہ تک رکھی جاتی ہیں۔ اگر مرنے والے کے نیک کرم زیادہ ہوئے تو اسے مورگ لوک یا بیکنٹھ میں بھیجا جاتا ہے اگر اعمال بد زیادہ ہوئے تو اس کا مقام "نرک" یعنی دوزخ ہوتا ہے۔ اگر اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو وہ اُس وقت تک "یونی چکر" میں رہتا ہے جب تک اسے خوش اعمالیوں کے بدولت "موکش" (نجات ابدی) یا بد اعمالیوں کے طفیل "نرک" حاصل نہ ہو جائے یا انسان کا بار بار جنم لینا بھی ایک معنی میں برزخ ہے۔

سنان دھرمی ہندوؤں میں مردوں کے ایصالِ ثواب کے لئے دان پُٹن کیا جاتا ہے۔ اور کنگالت بھی کھلائے جاتے ہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ جوار داج عالم برزخ میں ہوں ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے۔ مردوں کے ایصالِ ثواب کے لئے "گیا" کی جاتر بھی کی جاتی ہے۔ اور بارہویں بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات جب کسی شخص پر سکران موت شدید ہوتے ہیں تو تکلیف یا عذاب کم کرنے کے لئے اس شخص کو گائتری مانترا پانی پر دم کر کے پلا دیتے ہیں۔

یہودیوں کا خیال | یہودیوں اور قریب قریب تمام سامی النسل اقوام کا عقیدہ ایک ہی تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد روحیں آسمان پر رہتی ہیں۔ بعض یقین کرتے تھے کہ وہ اجرام سماوی میں رہتی ہیں اور بلحاظ اعمال جیسا کہ کسی روح کا مرتبہ ہوتا ہے ویسے ہی سیارے یا ستارے میں رہتی ہے۔ یہ خیال عموماً ان سامی النسل اقوام کا تھا جن پر بابل و اشور یا گے خیالات کا اثر پڑا تھا کیونکہ اہل بابل و آشور کا مذہب درحقیقت اجرام سماوی کی پرستش تھا اور ان کا سب سے بڑا معبود بعل، شمس، مردوخ یا ملوکی (آفتاب) کہلاتا تھا۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ روحیں زیر زمین رہتی ہیں (یہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا جو ایرانی اور مصری خیالات سے متاثر ہو چکے تھے) مگر زیادہ عام عقیدہ عبرانیوں کا یہ تھا کہ تمام ارواح وہ نیکو کار ہوں یا بدکار ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جسے وہ "شیول" کہتے تھے۔ اس مقام پر حساب و کتاب ہوتا تھا۔ جو لوگ نیکو کار ہوتے تھے انھیں

۱۔ اسی طرح تین دیوتا قدیم مصریوں میں اور تین فرشتے قدیم ایرانیوں میں روح کا حساب کتاب لیتے تھے۔ رومن کیتھولک عیسائی فرقہ کے عقیدہ میں صاحب میزان میکائیل فرشتہ ہے۔

فردوس میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہو کر ابد الابد تک اسی کے حضور میں مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ بدکار ہوتے تھے ان کی رو میں عذاب و عتاب کے لئے جہنم (جہنم) میں ڈال دی جاتی تھیں۔ جہاں ان پر روحانی اور جسمانی دونوں قسم کا عذاب ہوتا تھا۔ مگر چونکہ نہ ہر شخص پوری طرح نیک ہوتا ہے اور نہ کامل طور پر بد۔ اس لئے کم گنہگاروں کو ایک ایسے مقام پر رکھا جاتا تھا جو فردوس اور جہنم دونوں کے درمیان تھا یہ مقام "شیول" تھا جہاں گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی نسبت سے عذاب دے کر پاک و صاف کیا جاتا تھا تاکہ وہ دیدار خداوندی کے قابل ہو سکیں۔

بابل و آشوریہ دونوں میں مذہب انجم پرستی رائج تھی ان کا سب سے بڑا معبود آفتاب تھا جسے آشوریہ میں آشور (Assur) اور بابل میں بل و مردوخ کہتے تھے۔ ان لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ

ایسو (Ishtar) کے قریب زمین کے گرد ایک سمندر ہے اور وہاں ایک تاریک غار عظیم ہے۔ تمام فردوس کی رو میں اسی غار میں لے جا کر رکھی جاتی ہیں۔ جہاں وہ تاریکی اور گرد و غبار میں مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہاں ان کو ان کے گناہوں کی نسبت سے عذاب دے کر پاک و صاف کیا جاتا ہے۔ پھر جس روح کی طرف دیوتاؤں کی نگاہ مہربانی ہوتی ہے اور جس کے گناہ بھی صاف ہو جاتے ہیں اسے برزخ سے نکال کر ایک نہایت خوبصورت اور دلآویز جزیرہ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ ہمیشہ کے لئے عیش و مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی منظور نظر ارواح عموماً بادشاہوں کی رو میں ہوا کرتی تھیں۔ یہی باعث تھا کہ وہ لوگ اپنے نامور بادشاہوں کو درجہ الوہیت دیدیا کرتے تھے۔

مسیحیوں کا اعتقاد اس لئے پاک و صاف کیا جاتا ہے کہ وہ دربار الیزدی میں حاضر ہونے کے قابل ہو جائیں ان کا

عقیدہ یہ بھی تھا کہ روحوں کو ایصال ثواب سے فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ مقام جہاں ان گنہگاروں کو عذاب دیا جائے گا بقول بزرگان دین عیسوی زمین کے مرکز میں ہے اسے انگریزی زبان میں "ہیل" (Hell) کہتے ہیں جو ترجمہ ہے عبرانی لفظ "شیول" (Sheol) یونانی لفظ "ہیڈس" (Hades) اور عبرانی لفظ "جہنم" (Jehenna) کا ایک جگہ لفظ "تارتارس" (Tartarus) کا ترجمہ بھی (Hades) کیا گیا ہے۔ مگر بائبل کے اردو ترجمہ میں ان جملہ الفاظ کا صرف ایک ترجمہ یعنی جہنم ہے۔

۱۔ ہندوؤں کا ایشور اور آشوریوں کا آشور غالباً دونوں ایک ہیں۔

۲۔ عبرانی لفظ "شیول" عہد نامہ عتیق میں ۶۵ مرتبہ آیا ہے۔ جس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہیڈس (Hades) کیا گیا ہے مگر انگریزی زبان میں اس ترجمہ اس کا ترجمہ "جہنم" ۳۱ مرتبہ "قبر" اور ۳ مرتبہ غار یا گڑھا "کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کے اصلی معنی "پاتال" یا تاریک اور عمیق غار کے ہیں۔ عبرانیوں کے نزدیک "شیول" کا مفہوم دراصل انسان کی گزشتہ زندگی کا ایک فال مہوم تھا۔ جس میں وہ کرموں کے تمام تعلقات زندہ دنیا سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گویا شیول میں مردوں کی حالت ایک وجود ظلی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ اسیری بابل کے زمانہ میں جب یہودیوں کے خیالات و معتقدات پر ایرانیوں کے عقیدہ معاد کا اثر پڑا تو ان میں بھی حشر و نشر کا عقیدہ داخل ہو گیا۔ مگر اس وقت یہودی میں تین مختلف فرقے تھے۔ (۱) فریسی (۲) صدوقی (۳) ایشنی یعنی یونانی ان میں فریسی فرقہ عام طور پر عجیب خیالات و معتقدات سے متاثر ہو کر حشر و نشر کا قائل ہو گیا۔ صدوقیوں کا عقیدہ اپنے اسی پرانے مفہوم "شیول" پر قائم رہا۔ فرقہ سوم یعنی ایشنی (Essenes) یونانیوں کے اس عقیدہ پر قائم ہو گئے کہ روح لافانی ہے۔ نیز آنکہ متقی و پرہیزگار لوگوں کی رو میں بعد مرگ نہایت اچھی حالت میں رہتی ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۶۷ پر)

اس بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تقریباً تمام مذاہب قدیمہ میں کسی ایسی جگہ کا ہونا تسلیم کیا جاتا تھا جہاں مرنے کے بعد روحوں کو عذاب و ثواب کے نتیجہ اعمال کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا اور یہ انتظار بھی اعمال کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح عذاب و ثواب سے متعلق ہوتا تھا۔

قرآن پاک اور برزخ

کلام پاک میں لفظ برزخ تین جگہ آیا ہے۔ سورہ مومنوں میں ارشاد ہوتا ہے :-
 یہاں تک کہ ان میں سے ایک کو موت آئی اور اس نے کہا کہ اے خدا مجھے واپس کر دے تاکہ میں نیک اعمال کروں جو نہیں کئے تھے لیکن یہ صرف اس کا کہنا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے تو ایک حجاب ہے حشر کے دن تک۔

حتى اذا جاء احدهم الموت قال رب ارجعون۔ لعلی اعمل صالحا فیماترکت۔ انھا کلمۃ قائلھا ومن درالہم برزخ الی یوم یبعثون۔

سورہ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے :-

وهو الذي مرج البحرين هذا عذاب فرات وهذا ملح اجاج وجعل بينهما برزخا وجرا محجورا۔
 سورہ رحمان میں ہے :-

مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان۔
 اس نے دو سمندر جاری کئے جو ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن ان کے درمیان حجاب ہے اور وہ باہم دگرمل نہیں سکتے۔
 موخر الذکر دونوں آیتوں میں لفظ برزخ واضح طور پر لغوی حیثیت سے حجاب و پردہ یا آڑ کے مفہوم میں آیا ہے۔ کیونکہ دو سمندروں سے مراد یہاں بحر روم اور بحر احمر ہیں جن میں اول الذکر شیریں اور موخر الذکر شور ہے۔ یہاں موت یا بعد الموت کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

رہ گئی سورہ مومنوں کی آیت سو اس میں بھی ایک بات قابل غور یہ ہے کہ لفظ برزخ سے قبل لفظ درالہم آیا ہے جس میں ضمیر جمع کی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے جو جواب دیا ہے اس کا مخاطب درہی تنہا شخص نہیں ہے جس نے پھر دوبارہ

(بقیہ فٹ نوٹ) اسی کے ساتھ "شیول" کے مفہوم میں حسب ذیل دو باتیں بھی داخل ہو گئیں (۱) نیک بندوں کے لئے آغوش ابراہیم یعنی بہشت ہے اور (۲) خدا نا شناسوں کے لئے جہنم۔ عہد نامہ عتیق کی پہلی سات کتابوں میں جو لفظ "شیول" گیارہ مرتبہ آیا ہے اس کا ترجمہ یونانی زبان میں "ہیڈس" (Hades) کیا گیا ہے۔ یہی لفظ عہد نامہ جدید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے۔ مگر وہاں اس کا ترجمہ "جہنم" کیا گیا ہے علاوہ ازیں لفظ "جہنم" کا بھی ترجمہ "دوزخ" یا "جہنم" کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد نامہ عتیق میں "جہنم" (Jehenna) سے دادی (Hinnom) مراد ہے جو شہر یروشلم کے متصل واقع تھی اور چونکہ یہاں فتح یہود سے قبل ملوخ (maloch) کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور اعاز (Hinnom) اور ہنوم (manah) کے بتوں پر انسانی قربانیاں کی جایا کرتی تھیں۔ اس لئے اس دادی کو یہودیوں نے ناپاک قرار دیا۔ اور بعد ازاں وہ مقام شہر بھر کا مزبد بن گیا تھا۔ جہاں تمام شہر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس گھورے میں آگ لگا دی جاتی تھی جو آہستہ آہستہ ہمیشہ جلتی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس مقام کو مقام عذاب کی تصویر سمجھنے لگے۔ جہاں ان کے ضمیر کے لعن طعن کی دلخراش تکلیف رقع ہوتی ہے۔ آگ بجھتی ہے۔ یہی دادی عتیق یعنی دادی ہنوم یہودی ربیوں کے نزدیک قصر دوزخ بن گئی تھی۔

دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو کی کھتی۔ بلکہ تمام وہ لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ یا اسلام کے دشمن تھے خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ۔ اس لئے یہاں بھی لفظ برزخ خصوصیت کے ساتھ کسی ایسے عالم یا مقام کے لئے استعمال نہیں ہوا جس کا تعلق عالم بعد الموت سے ہے۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض بے بصری، اور کور باطنی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ برزخ کے لغوی معنی حجاب، پردہ، روک کے ہیں اور لغوی معنی سے علیحدہ کوئی اصطلاحی معنی کلام مجید میں نظر نہیں آتے اس لئے اگر مسلمانوں میں روح کے لئے کوئی عالم برزخ، دیگر مذاہب قدیمہ کے اعتقاد کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری کلام پاک پر نہیں ہے اور نہ اس کے صحیح مانتے پر کوئی مسلمان مجبور ہو سکتا ہے۔

(۲)

فردوسی اور عربی الفاظ

(جناب ضیاء الرحمان - پشاور)

فردوسی کی شاعری کا ایک کارنامہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی ہزاروں اشعار کی مثنوی شاہنامہ میں کوئی لفظ عربی کا استعمال نہیں کیا اور فارسی کا سب سے پہلا شاعر جس نے اس کا التزام کیا، فردوسی ہی تھا۔ کیا یہ خیال صحیح ہے؟

(نگار) سب سے پہلادہ فارسی شاعر جس نے عربی الفاظ کے بجائے خاص فارسی الفاظ کا استعمال شروع کیا فردوسی نہ تھا بلکہ دقیقی تھا۔ یہ دہی دقیقی ہے جن نے نوح بن مقصور سامانی فرمانروا کے زمانہ میں سب سے پہلے شاہنامہ لکھنے کی طرح ڈالی اور اگر اس کا ایک خوشہ و غلام جس سے دقیقی کو بہت لگاؤ تھا، اسے ہلاک نہ کر دیتا تو شاہنامہ اس دقت مکمل ہو جاتا اور فردوسی مصنف شاہنامہ ہونے کی عزت حاصل نہ کر سکتا۔

دقیقی ۳۲۹ھ میں قتل ہوا اور فردوسی ۳۲۹ھ میں پیدا ہوا، یعنی فردوسی کی عمر وفات دقیقی کے دقت صرف بارہ سال کی تھی۔ جب وہ جوان ہوا اور شعر و شاعری شروع کی تو دقیقی کے اشعار شاہنامہ بھی اس کی نگاہ سے گزرے اور وہ اس نامکمل مثنوی کی تکمیل میں لگ گیا جس کا ذکر خود فردوسی نے بھی کیا ہے۔

کنوں راز ہا باز جویم ترا	حدیث دقیقی بگویم ترا
من این نامہ فرخ گرفتم بہ فال	ہمی رنج بردم بہ بسیار سالی
سخن رانگہ داشتہ سال بسیت	ہداں تا سزا در این گنج کیست

بہر حال یہ سمجھنا کہ فردوسی نے محمود کی فرمائش پر شاہنامہ لکھنا شروع کیا، صحیح نہیں، وہ ۲۰۵ سال پہلے ہی اس کا آغاز کر چکا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل یقیناً محمود کے زمانہ میں ہوئی خیر یہ ذکر تو ضمناً آگیا اصل بحث تو شاہنامہ میں عربی الفاظ کے استعمال نہ کرنے کی تھی۔ سو جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا اس کا سہرا دراصل دقیقی کے سر ہے۔ فردوسی نے بھی یقیناً اس باب میں دقیقی کا تتبع کیا۔ لیکن یہ کہنا کہ شاہنامہ یکسر عربی الفاظ سے خالی ہے درست نہیں۔ متعدد الفاظ عربی کے جو اس عہد کی فارسی میں رائج ہو چکے تھے شاہنامہ میں

موجود ہیں۔ تاہم فردوسی نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ حتی الامکان وہ عربی الفاظ استعمال نہ کرے یہاں تک کہ بعض فلسفیانہ عربی اصطلاحوں کا ترجمہ بھی اس نے فارسی میں کیا گو اصطلاح کی حیثیت انھیں حاصل نہ ہو سکی۔ مولانا شبلی نے اس کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً:-
 مادہ کا ترجمہ سرمایہ - عنصر کا ترجمہ گوہر - وجود کا ترجمہ توانائی - حرکت کا ترجمہ گردش - متحرک بالارادہ کا ترجمہ پویندہ
 وغیرہ۔ علاوہ اصطلاحوں کے یوں بھی متعدد الفاظ عربی کے اس کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض اپنی حقیقی معنی میں استعمال کئے گئے ہیں اور بعض مجازی مفہوم میں مثلاً لفظ مزج (بہ معنی طعن و ظرافت) - نخ (بہ معنی صفت) - زحیر (بہ معنی پیچ و تاب) قرطہ (بہ معنی کرتا) شاہنامہ صرت داستان رزم نہیں ہے، بلکہ قدیم ایران کی معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا ذکر اس نے نہ کیا ہو۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھے پوچھا کہ قدیم ایران کی عورتیں پردہ کرتی تھیں یا نہیں۔ تو میں نے کہا کہ فردوسی کے کلام سے تو ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ کہتا ہے:-

ہمہ دخت ترکان پوشیدہ رئے ہمہ سر و قد و ہمہ مشک بوئے

میزہ منم دخت افراسیاب برہنہ نریدہ تنم آفتاب

آپ نے سوال صرف عربی الفاظ کے ترک استعمال کے متعلق کیا تھا لیکن اس ضمن میں اور بھی چند غیر متعلق باتیں قلم سے نکل گئیں معافی چاہتا ہوں۔

(۳)

پل صراط

آفتاب احمد - دستگیر کالونی - کراچی

بہت سی ایسی باتیں ہیں جو مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں اور علم ان کے مانتے پر راضی نہیں ان ہی میں ایک مسئلہ پل صراط بھی ہے جس کی وضاحت میں بے اکثر اہل علم سے چاہی ہے جن کی رائے اس مسئلہ پر مختلف پائی لیکن مولویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ "قیامت کے دن تمام آدمی ایک پل سے گزریں گے جس کا نام صراط ہے۔ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اچھے اعمال رکھنے والے اس سے محفوظ گزر جائیں گے اور جو گناہگار ہیں وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

میں ممنون ہوں گا اگر جناب والا اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ اسلام کا نظریہ اس باب میں کیا ہے؟

(نگار) آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل داعیوں نے کس کس طرح اسلام کو بدنام کیا ہے اور ان کی گندہ تصانیف نے بانی اسلام پر کیا گستاخیاں کی ہیں۔ ایک صراط پر کیا موقوف ہے اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیمات اسلامی میں، لیکن آج وہ عام مسلمانوں کے نہایت اہم عقائد میں شامل نظر آتی ہیں۔ جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں عرب میں موسوی۔ عیسوی اور زرتشتی مذاہب کے اثرات ہر جگہ پائے جاتے تھے اور ان کی روایات عام طور پر بیان کی جاتی تھیں۔ چونکہ عرب خود بت پرست تھے اور وہ کسی الہامی کتاب رکھنے کے مدعی نہ تھے اس لئے ان مذاہب سے

بڑی حد تک مرعوب و متاثر ہو رہے تھے اور ان کے خاندانوں میں ایک زمانہ نامعلوم سے ان مذاہب کی بہت سی روایتیں منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں۔

حب ظہور اسلام ہوا اور اس نے عربوں کی ذہنیت کو ان تمام ایسا طبری خرافات سے پاک کرنا چاہا تو اسکو بہت قسطنطین پیش آئیں کیونکہ صدیوں سے جو باتیں ذہن میں مرتسم چلی آتی تھیں ان کا دفعتاً محو کرنا آسان نہیں تھا تاہم اس نے اساس و بنیاد کے طور پر ایک ایسی چیز (کلام مجید) پیش کر دی جو اس نوع کے لغویات سے پاک تھی اور ہر چند ابتدائے عہد اسلام میں لوگوں کو اس کے حقیقی مفہوم پر بحث و تمحیص کا موقعہ نہیں ملا تاہم اُس نے ایک ایسے صاف و سادہ مذہب کی داغ بیل ضرور ڈال دی جو انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی تعلقات کے لحاظ سے نہایت ہی پائدار اور بلند مستقبل اپنے اندر رکھتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ رسول اللہ نے اتنی عمر پائی کہ وہ اس بنیاد کو مستحکم کر جاتے اور نہ آپ کے بعد خلفاء کو اندر دنی سازشوں اور سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے اس کی فرصت نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ مذہب اسلام نام ہو گیا حکومت اسلام کا اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہ کے نام سے گڑھی اور روایت کی جاتی تھیں پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کی بناء پر وضع کیا گیا اور ایک حصہ دوسرے جس میں دل کھول کر دیگر مذاہب کی ان تمام روایتوں کو لے لیا جو عرب خاندانوں میں رائج تھیں اور تھوڑا سا تغیر کر کے ان کو "سلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ ان ہی میں وہ احادیث جو صراط (عوام کی زبان میں پل صراط) کے متعلق آپ کو کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ یہ خیال صریح ایرانی روایات سے ماخوذ ہے۔ لفظ صراط عربی لفظ نہیں ہے بلکہ فارسی لفظ "چنوت" کا معرب ہے۔ اوستا میں ایک لفظ ہے "چنوتو پر دتوں" جس کے معنی ہیں "نیک و بد شمار کرنے والے کا پل" یہی لفظ مخفف ہو کر فارسی میں چنوت ہوا اور عربی میں صراط۔

زردشتیوں میں اس پل کے متعلق جو روایت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو پل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا احتساب ہوتا ہے۔ پہلوی کتاب دناکارت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:-
"میں تیری عبادت نیک خیال اور نیک عمل کے ساتھ کرتا ہوں تاکہ میں روشنی کے راستہ میں رہوں۔
دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوں۔ اور پل چنوت کو عبور کر کے اس جگہ پہنچ جاؤں جو کہتوں سے معطر اور مسرتوں سے معمور ہے۔"

اوستا میں بھی آپ کو یہی خیال نظر آئے گا چنانچہ نیک عورتوں اور مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-
"انھیں بھی میں تم جیسے آدمیوں کی دعاؤں کے ذریعے سے لے جاؤں گا اور تمام برکتوں کے ساتھ پل چنوت تک ان کی رہنمائی کر دوں گا۔" (یسنا - ۴۶ - ۱۰)

اس نوع کا عقیدہ نہ صرف قدیم ایرانیوں میں بلکہ تمام آریہ قوموں میں پایا جاتا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں وہ پہنچے یہ اعتقاد اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ناردرے اور سوڈن کی قدیم روایات میں ایک چیز "بفر دست" نظر آتی ہے جسے عام طور پر دیوتا کا پل کہتے ہیں اور اس سے مراد ان کی غالباً قوس قزح ہے۔ یہی خیال ادنیٰ تغیر کے ساتھ یونانیوں میں بھی آیا۔ چنانچہ وہ قوس قزح کو دیوتاؤں کا قاصد کہا کرتے تھے۔ غرض کہ صراط کے متعلق جو روایات مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں وہ یکسر ایرانی روایات ہیں اور قول رسول سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

کلام مجید میں کم و بیش چالیس جگہ لفظ صراط استعمال کیا گیا ہے لیکن آپ کو کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس میں ان خرافات

کی تصدیق کی گئی ہو۔ قرآن میں صراط کی صفت میں زیادہ تر لفظ مستقیم استعمال ہوا ہے اور کہیں حمید اور سوجی کے الفاظ اور کسی ایک جگہ بھی راہ عمل کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں لیا گیا۔ پس یہ تو ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں قبل بعثت نبوی لفظ صراط فارسی زبان کے لفظ جنوات سے معرب کر کے لے لیا گیا ہو اور اسی کے ساتھ ایرانی روایات بھی اس کے متعلق رائج ہو گئی ہوں لیکن کلام مجید میں لفظ صراط صرف راہ یا راستہ کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایرانی روایات کا عدم شمول اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔

(۴) زلف شبگیر

سید حیدر عباس - لاہور

اردو کے ایک نہایت مشہور شاعر نے اپنے ایک شعر میں "زلف شبگیر" کا استعمال کیا ہے کیا یہ استعمال درست ہے؟

(نگار) آپ نے شعر نقل نہیں کیا۔ لیکن اگر شاعر نے یہ لفظ "زلف شب رنگ" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو قطعاً نادرست ہے۔

فارسی میں لفظ شب گیر کا ایک ہی مفہوم ہے، یعنی صبح صادق (سحر کا ترک کا، یاد دہندہ لکھا) اور اس سے بہت کر کسی دوسرے مفہوم میں اس کا استعمال فارسی میں نہیں ہوتا۔ مظہر کاشی کہتا ہے:-

ساقیا شب گیر شد شمع شبستانی بیار بزم ردھانی بپاکن جام ردھانی بیار
چنانچہ آہ شب گیر اور نالہ شب گیر، اسی آہ و نالہ کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت سر کیا جائے۔
خرد سانا لہ شبگیر بردار مرا بے ہنر باں در نالہ مگرار

اور صبح کے ساتھ شبگیر کی نسبت اتنی عام ہو گئی کہ صبح کے وقت کوچ کرنے کے مفہوم میں بھی اسے استعمال کرنے لگے۔ فردوسی کہتا ہے:-

بہر حال زلف کی صفت شب گیر قرار دینا درست نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ صبح کو شبگیر کیوں کہتے ہیں جبکہ مصدر گرفتن کا اسم فاعل ترکیبی ہے اور گرفتن کے معنی صرف لینا یا حاصل کرنا ہے اور صبح سے اس کا تعلق نہیں لیکن بات یہ ہے کہ گرفتن بڑا کثیر المعانی مصدر ہے (جنکی تفصیل و وضاحت کا موقعہ نہیں) اور اس کا ایک مفہوم پکڑ لینا اور روک دینا بھی ہے۔

سعدی کا مصرع ہے:-
سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل

جس میں گرفتن روک دینے کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اس لئے شب گرفتن کے معنی ہوئے رات کو ختم کر دینا اور چونکہ صبح رات کا اختتام ہے اسی لئے اسے شب گیر کہتے ہیں۔

منظومات

قلم کار

نصا ابن فیضی

علم و تہذیب کے یہ بولتے آذر خانے
جھلملاتی ہوئی ذہنوں کے دیرچوں پہ کرن
بھیکے بھیکے یہ شرابوں کی لطافت میں شعور
کشتِ تخیل میں کھلتے ہوئے عارض کے گلاب
منتہا فکر کی پس "سینہ و ابرو و کمر"
وہی مسجود جنوں، "نرگس میخانہ فروز"
یوں بہ ظاہر ہیں دل آویز سخن کے خط و خال
خون دل، صرفہ آرائش رخسارِ غزل
زعفراں بوتا ہے الفاظ کے سینوں میں خیال
نوکِ خامہ سے ہیں تخلیق کے سوتے جاری
پرفشاں اورج سخن پر ہے "تخیل کا بلوغ"
چتونوں سے تو جھلمکتا ہے "حکیمانہ شعور"
عرش کو چھوتی ہوئی فکر کی پروازِ جلیل

نفسِ گل سے مُعطر یہ حسیں کاشا نے
ہر نئے موڑ پر آباد کوئی "شہرِ سخن"
ہر نفس پر یہ بکھرتا ہوا مستی کا و فور
جامِ اشعار میں ڈھلتی ہوئی آنکھوں کی شراب
سب کے پہلو میں ترازو ہے وہی "تیرِ نظر"
وہی جذبات کی شبنم وہی افسوں وہی سوز
ہے مگر گرمی احساس سے محروم خیال
سوئی سوئی سی مگر خلوتِ گلنارِ غزل
رنگ و نکہت کا مگر آج بھی ہے شہر میں کال
لیکن اربابِ نظر کی ہے وہی ناداری
ہے دھند لکوں میں مگر صبحِ بصیرت کا فروغ
ہیں مگر ذہن و نظر منزلِ ادراک سے دور
مستیِ ذوق مگر پاؤں میں ٹھونکے ہوئے کیل

ارتقاء

(خلائی مسافروں کے نام)

اولیں احمد دوراں

بڑھ کے اٹھانے لگی مددے خلا سے نقاب
توڑ چکی ہر طلسم چشم بصیرت مآب
اب نہ مظاہر کا سحر اب نہ فریب حجاب
اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن

سینہ یزداں کے راز ہونے لگے آشکار
نور ازل سے ہوئی روح بشر ہمکار
دونوں ہی قرون سے تھے ملتہب و مقرر
اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن

جلوہ فشاں دمبدم حسن رخ کائنات
اپنی تب و تاب سے تازہ درخشاں حیات
ہچکیاں لیتی ہے آج وہم کی تاریک رات
اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن

نقش گرا ارتقاء ذوق فنون و علوم
دست بشر سے قریب خلوت ماہ و نجوم
ضامن راہ نجات ترک قیود و رسوم

اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن
کتنی ہمہ گیر ہے کتنی جنوں خیز ہے
جذبہ و تاثیر کے حسن سے لبریز ہے
اہل سفر کے لئے مشعل و مہینہ ہے

اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن
گردش لیل و نہار عقل کے ادنی غلام
رہرو بیدار پر دور تعطل حرام
آدم خاکی کی رو مثل صبا تیز گام

اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن
گوہر فکر و عمل ظلمت شب میں چراغ
بسمل خواب و جمود سینہ گیتی کا داغ
بے طلب آتے نہیں سامنے مٹے کے ایارغ

اے دل ناکام سن
وقت کے بریطکی دھن
مہتی انساں کہ ہے دہریں مثل حجاب

کارگاہ آب و گل مرکز علم و ہنر
مقصد انساں یہاں جستجوئے رہگذر
ایک مسلسل تلاش ایک مسلسل سفر
اے دل ناکام سن

وقت کے بربط کی دھن

زندگی کی آبرو جاگتے رہنے میں ہے
لطف رہ عشق کی سختیاں سہنے میں ہے
لطف جہاں نوبہ نو داستاں کہنے میں ہے

اے دل ناکام سن

وقت کے بربط کی دھن



اے دل ناکام سن
وقت کے بربط کی دھن
آمری نظروں سے دیکھ رہگذر حبیبیل
آئینہ ماہ میں زینت کا عکس جلیل
اک ذرا سی مشت خاک اتنی عظیم و جلیل
اے دل ناکام سن

وقت کے بربط کی دھن

چار سو پھیلے ہوئے صنعت ارضی کے جال
نقشہ تعمیر حسن کاوش اہل کمال
محنت آدم سے ہے خلد زمیں کا جمال

اے دل ناکام سن

وقت کے بربط کی دھن

سعادت نظیر

خدا گواہ کہ دیکھا، اور آنکھ بھر دیکھا
نگاہ شوق سے سو بار سوئے در دیکھا
نظیر! آتشِ غم کو جو تیز تر دیکھا

جدھر نظر کی، اُدھر حسنِ فتنہ گرد دیکھا
یقین تھا کہ نہ آئیں گے وہ مگر پھر بھی
مجھے مجھے سے نظر آئے آرزو کے چراغ

شارق میرٹھی

چاہتا ہوں بھولنا اُس کو بھلا سکتا نہیں
کوئی طوفان ان چراغوں کو بجھا سکتا نہیں
زندگی بھرنے کو میں شارق بھلا سکتا نہیں

دیکھنا مجبور می ذوقِ محبت دیکھنا!
جو تمھاری یاد نے روشن کئے ہیں شامِ غم
حادثے ایسے بھی کچھ گزرے ہیں مجھ پر شامِ غم

نہیں ہے خوف مجھے راہ کے اندھیروں کا
وہ اک تڑپ جو نہیں بجلیوں کو بھی حاصل
یہ اور بات ہے خاموش ہوں محفل
میں کیا بتاؤں کہ کن عظمتوں کا حامل ہے
نہ جانے کونسی جانب سے کوئی آجائے
کہ منزلوں کے آجائے نظر میں رکھتا ہوں
میں اپنے ٹوٹے ہوئے بال و پر میں رکھتا ہوں
ہزار شکوے دل غم اثر میں رکھتا ہوں
جو ذوق بندگی میں اپنے سر میں رکھتا ہوں
جلا کے شمع ہر اک رہگذر میں رکھتا ہوں

تالیش - شجاع آبادی

کسی غریب کے دل کی نہ آگ بھڑکاؤ
اثر نہ ہو گا کبھی ان کی چشم پر ہم پر
ہجوم یاس کے بادل گھرے ہیں تالیش پر
کہیں لپیٹ میں اس کی نہ تم بھی آجاؤ
ہر ایک موئے بدن سے ہو بھی ٹپکاؤ
خدا بچائے تمہیں اے مری تمناؤ

ملاقاتیں - مداراتیں رہی ہیں
ملا جب کوئی دیوانہ سہ راہ
پیا ہے جام ہم نے یوں بھی تالیش
بڑی پُر لطف کچھ راتیں رہی ہیں
دل مرحوم کی باتیں رہی ہیں
کہ ہونٹوں پر مناجاتیں رہی ہیں

غموں نے کر دیا احساس سے ہمیں محروم
مجھے سکون میسر تھا جس خلش کے طفیل
بجا نہیں یہ کسی پیکر کرم کے لئے
ہوا ہے ہم پر کرم یا ستم نہیں معلوم
نہ جانے دل سے مرے ہو گئی وہ کیوں معلوم
کہ اس کے در پہ ہو کوئی پُرا ہوا مظلوم

مقام ہوش و خرد چھین لے جو اے تالیش
زمانہ اس کو سمجھتا ہے نیک اور معصوم

مطبوعہ موصوف

اردو غزل کے پچاس سال | ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے موصوف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی ہے مصنف کا اصل مقصود اگرچہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیانی عہد کو سامنے رکھ کر غزل کے فنی و معنوی ارتقاء پر بحث کرنا تھا لیکن تمہید کے طور پر اس مقالہ میں اردو فارسی غزل کی پوری تاریخ بالا حمال سمٹ آئی ہے۔

فاضل مصنف نے باب اول میں 'فکر و فن' کے تحت غزل کے نظری مسائل پر بحث کی ہے اور ہیئت و موضوع کے لوازم و خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ باب دوم میں انیسویں صدی عیسوی کی ان سیاسی و ملی تحریکات کا ذکر ہے جنہوں نے برصغیر کی تمدنی زندگی میں اک انقلاب پیدا کر دیا تھا اور جن کے زیر اثر اردو شعراء کا انداز فکر و فنی بھی یکسر بدل گیا۔ بعد ازاں 'حالی'، 'امعیل میرٹھی'، 'وحید الدین سلیم'، 'چکبست' اور اکبر الہ آبادی کی غزل گوئی پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اتنا دافرمواد ہم پہنچاتی ہے کہ ان شعراء کی غزل گوئی کے متعلق شاید کہیں اور نہ مل سکے۔

لیکن حیرت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس دور کے ممتاز غزل گو شعراء مثلاً شاد، جلال، امیر، داغ اور تسلیم وغیرہ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ ان کے ذکر کے بغیر اس عہد کی غزل گوئی کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کی نظر اس خشک اور بے جان غزل گوئی پر رہی ہے جسے 'جدید غزل' سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے حالی نے ڈھلتی عمر میں سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر شروع کیا تھا۔

۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے جن درمیانی عہد کا جائزہ مصنف نے لیا ہے اس میں حالی، اکبر، امعیل، وحید اور چکبست میں سے کسی کو بھی صف اول کا غزل گو شاعر نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے اصناف میں ان کے کمال سخن گوئی کو ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا لیکن ان کی غزل گوئی نے اردو شاعری پر کوئی مستقل و مثبت اثر نہیں چھوڑا اس لئے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ممتاز متغزلین مثلاً حالی، اصغر، جگر، آرزو، عزیز، یگانہ اور فراق وغیرہ پر جن شعراء کے لب لہجہ اور انداز تغزل کا اثر نمایاں ہے وہ حالی، چکبست، امعیل، اکبر اور وحید نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں اس کتاب میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس پہلو سے قطع نظر کتاب ہر لحاظ سے قدر اول کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اردو غزل کا تاریخی جائزہ کچھ اتنی تفصیل و تحقیق سے لیا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی اور کتاب نظر نہیں آتی۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔

۲۰۰ صفحات کی یہ کتاب سات روپیہ پچاس پیسے میں مکتبہ کلیاں بشیرت گنج، لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

خروش جرس | محمد اسحق فاروقی رونق کا مجموعہ کلام ہے جسے ملک دین محمد ایڈ سنرز نے اشاعت منزل، بل روڈ، لاہور سے شائع کیا ہے۔ آغاز کتاب میں سید مختار حسین لکھنوی نے مصنف کے حالات زندگی اور کلام پر بالاختصار روشنی ڈالی ہے۔ دیباچہ میں ڈاکٹر قطب الدین احمد نے 'خروش جرس' کے محاسن کی فہرست دی ہے۔ آخر میں جائزہ کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی چند سطریں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا خیال ہے کہ "مصنف نے فن شعر گوئی کے لئے کافی ریاضت کی ہے اور ظاہر ہے کہ ریاضت بے ثمر نہیں رہتی۔ چنانچہ مصنف نے قواعد شعر کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے خیالات کے اظہار میں مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ رونق کا کلام بلحاظ زبان و بیان بڑا پاکیزہ ہے اور اس میں فنی مہارت کی وہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں جو قدیم طرز سخن گوئی کا طرہ امتیاز خیال کی جاتی ہیں۔

غزل کی طرح رونق کی نظمیں بھی صنائعِ لفظی و معنوی سے آراستہ اور قابلِ مطالعہ ہیں، ضخامت، کتابت، طباعت اور کاغذ کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت پانچ روپیہ بہت مناسب ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین — ناشر مکتبہ جامعہ تعلیم ملی میر سٹی، کراچی

تعلیمی خطبات

سرورق عمدہ، ٹائپ خوبصورت، کاغذ پائیدار۔ قیمت — چھ روپیہ۔
یوں تو اردو میں متعدد اہل قلم کے خطبات شائع ہو چکے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل بھی ہیں، لیکن خطبات کے یہ مجموعے، عموماً مختلف النوع مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں بہت کم ایسے ہیں جن میں صحافت سے بہت کر علم و فن کے کسی مستقل موضوع پر بار بار غور کیا گیا ہو۔ اور کسی مخصوص انداز فکر کو عملاً بروئے کار لانے کی مسلسل سعی کی گئی ہو۔
ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطبات کی نوعیت، دوسروں کے خطبوں سے یکسر مختلف ہے۔ ان میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے تعلیم و تدریس کے اہم مسائل پر طرح طرح سے سوچا ہے، اور مشرق و مغرب کے مفکرین تعلیم کے اقوال و نظریات کو سامنے رکھ کر پاک و ہند کے تعلیمی نظام و معیار کے لئے نہایت کارآمد اور قابلِ عمل مشورے دیئے ہیں۔

یہ خطبات ایک طرف مصنف کی فکر انگیز طبیعت، علمی و فنی شغف، کام کرنے کی مخلصانہ لگن، قومی و ملی درد اور تعلیمی و تدریسی دیکھ بھلی کا پتہ دیتے ہیں، دوسری طرف اس خطبہ نہ صلاحیت کی نشان دہی بھی کرتے ہیں جو صحافت کو پس پشت ڈال کر زبان و بیان میں تخلیقی ادب کا رنگ بھردیتی ہے۔ مولانا شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خطبات کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق و عقائد اور میلانات طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اُن کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جو اُن کے جذبات کو برا لگینے سے بچائے اور اپنے کام میں لاوے۔

ذاکر صاحب کے خطبات میں خطابت کا یہ بنیادی عنصر ملتا ہے۔ لیکن جو چیز ان خطبات کو اہم تر بناتی ہے وہ اُن کا دلکش اسلوب ہے اس اسلوب میں ایک خاص سطح بھی ہے، گہرائی بھی، سادگی بھی ہے، پرکاری بھی، رعنائی بھی ہے، اور دل نشینی بھی۔ مقصدیت بھی ہے، جامعیت بھی، فکر کی پرچھائیاں بھی ہیں، جذبات کے سائے بھی۔ روزمرہ کی بات چیت کا لطف بھی ہے اور علمی بحث کی سنجیدگی بھی، شوخی و طرافت کے گلبائے رنگارنگ بھی ہیں اور طنز کے تیر و نشتر بھی۔

غرض یہ کتاب نہ صرف موضوع و مواد بلکہ مخصوص اسلوب کے سبب بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اور یقیناً ہے کہ اہل علم و ادب کے حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

سازدِل میں ذکی کا کوروی کی چند نظمیں اور بیترغزلیں شامل ہیں۔ پیرغزلیں اور نظمیں ۱۳۳۰ء اور ۱۳۳۱ء کے درمیان لکھی گئی ہیں اور ان کا لحاظ سے انہیں اُن ہنگاموں سے متعلق ہونا چاہئے تھا جن کے اظہار کو آج کا ہر شاعر اپنے لئے فخر خیال کرتا ہے، خواہ یہ اظہار فرضی اور بھونڈا ہی کیوں نہ ہو۔

ذکی کا کوروی نے غیر شعوری طور پر اپنی شاعری کو وقتی اور صحافتی ہنگاموں کے اثرات سے بھاریا ہے اور "سازدِل" پر غوغا وہ نئے چھیرے ہیں جن کا اثر زمان و مکان کی ہر گردش سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ نئے بظاہر حسن و عشق کے جہان کہتے ہیں، لیکن تجربات کی نوعیت اور اسلوب کی ندرت کے لحاظ سے اُن پر آج بھی نو بہ نوادہ نازہ بہ نازہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

ذکی کے خیالات و موضوعات میں ندرت و عمق ہو یا نہ ہو، لیکن اُن میں ایک طرح کی سچائی اور دل نشینی ضرور پائی جاتی ہے۔ ایسی دل نشینی اور سچائی جو بعض چھوٹی بجزوں میں مجسم ہو سکتی بن گئی ہے۔

کتابت و طباعت بھی اچھی ہے اور ۹۶ صفحات کا یہ مجموعہ کلام، دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ سے ایک روپیہ پچاس پیسے میں مل سکتا ہے۔

مثنوی سیر کراچی

از شبہم رومانی — صفحات ۱۴۶ — قیمت دو روپیہ پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ — دی ہبک کارپوریشن، آرام باغ روڈ - کراچی ۱۔

”مثنوی سیر کراچی“ اردو کی مقبول ترین مثنوی ”سحرالبیان“ کی زمین میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کی مستقل بحرین عموماً اور بحر متقارب خصوصاً زبان و بیان کا نہایت سادہ و پرکار لب و لہجہ چاہتی ہے۔ یہ لب و لہجہ اس مثنوی کے اکثر اجزاء میں ملتا ہے۔ ہر چند کہ یہ مثنوی بلحاظ موضوع صحافت سے بہت قریب ہے اور خواص کے ذوق شعری کی تسکین کا سامان اس میں بہت کم ہے پھر بھی حسن بیان کی بعض خوبیوں نے اسے عام و خاص دونوں کے لئے دلچسپ بنا دیا ہے۔

امید ہے کہ بیان کی سلاست و روانی، واقعات کی جزئیات نگاری، استعارات کی جزالت، مصرعوں کی جرتنگی اور اسم علم کی ذوقیت کے بسبب یہ مثنوی قبول عام حاصل کرے گی اور لطف لے کر پڑھی جائے گی۔

مدیر - الطاف حسین قریشی — صفحات ۳۲۰

ملنے کا پتہ — مین روڈ - سمن آباد - لاہور

اردو ڈائجسٹ

سالنامہ ۱۹۶۴ء

اردو میں رسائل و جرائد کی کمی نہیں ہے۔ روزنامے، ہفتہ وار، پندرہ روزہ - ماہنامے اور سہ ماہی ہر قسم کے پرچے نکلتے ہیں اور اپنا اپنا حلقہ اثر بھی رکھتے ہیں، لیکن یہ حلقے کچھ زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ خالص علمی و ادبی پرچوں کا دائرہ اثر اگر محدود ہو تو چنداں حیرت کی بات نہیں۔ استعجاب اس امر پر ہے کہ تعلیمی و تفریحی - سماجی و معاشرتی اور ثقافتی و تہذیبی پرچے پڑھنے والوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں خواندگی کافی حد تک کم ہے۔ لیکن دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری صحافت ابھی متوازن و معیاری سطح سے آشنا نہیں ہوئی جس کا نمونہ ہمیں زیر نظر اردو ڈائجسٹ میں ملتا ہے۔

رسالے کے مدیر الطاف حسین قریشی نے نہ صرف یہ کہ متنوع مضامین کی مدد سے اس پرچے کو ”جہاں نما“ بنا دیا ہے بلکہ ذوق ادب کی تربیت و تسکین کا سامان بھی فراہم کر دیا ہے۔ چنانچہ اس پرچے کے مطالعہ سے جہاں بعض علم و فن کے مختلف گوشوں سے واقفیت ہوتی ہے وہاں قلب و روح کو وہ طمانیت بھی میسر آتی ہے جو سنجیدہ و پاکیزہ مطالعہ کا فائدہ ہے۔

معنوی حسن کے ساتھ سالنامہ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ سرورق سادہ ہے لیکن دلکشی سے خالی نہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے کاغذ سفید اور ردیر پاپا ہے۔

شارق میرٹھی کا مجموعہ کلام ہے جسے مکتبہ دانش محل لکھنؤ نے بڑے سلیف سے شائع کیا ہے۔

پادہ و جام

شارق میرٹھی کا کلام گزشتہ پچیس سال سے برصغیر کے معیاری صحیفوں میں شائع ہو رہا ہے اس لئے یقین ہے کہ اہل ذوق، اُن کے انداز فکر و سخن سے کم و بیش ضرور آشنا ہوں گے۔

شارق میرٹھی اپنے عہد کے بدلتے ہوئے تہذیبی عناصر اور سماجی عوامل سے عام انسانوں کی طرح متاثر ہیں اس لئے ان کے یہاں دو بھارت کی ترجائی کا احساس بھی ملتا ہے۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح جدید کی دھن میں انہوں نے قدیم کو یکسر نظر انداز کر دینے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کے اسلوب جدید کا دامن، قدیم اسلوب سے ملا ہوا ہے اور فن شعر کے سلسلے میں روایت و ہدایت کا یہی امتزاج اُن کے کلام میں وہ حسن اور زور پیدا کرتا ہے جس سے بعض معاصرین محروم ہیں۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے کیسے پاکیزہ ہیں۔

مجت پہ قیامت ڈھانڈ جائے ترے لب پر مرا نام آئے جائے
پھر اس کے دیدگی حسرت ہے دل کو، کہ جس کو دیکھ کر دیکھا نہ جائے
زیست کا انجام کیا ہے، گردشِ دوراں ہے کیا ہاتھ میں ہو جام تو بہ کس سے سوچا جائے ہے
رونقِ بزم بھی ہے گرمی بازار بھی ہے، دیکھنا یہ ہے کوئی دل کا خریدار بھی ہے
تسم آگیا اُن کے لبوں پر مجھے راس آگئی اُن کی تباہی
ہوائے تند ہو یا برق و باراں یہ ساری آفتیں ہیں آشیاں تک
مری بربادیاں پھر رنگ لائیں، اُجالا ہے قفس سے آشیاں تک
اے دل تجھے سکون کی دولت نصیب ہو رہتا ہے بے قرار کوئی عمر بھر کہاں

کتابت و طباعت بھی بہت اچھی ہے، کاغذ سفید و دبیز اور سرورق مناسب ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ہے۔

تحقیق و تنقید | مجموعہ ہے جناب فرمان فچوری کے پندرہ تحقیقی و انتقادی مقالات کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور بہت پسند کیے گئے ہیں۔

جناب فرمان کراچی یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ ایک اُستادِ معلم کی حیثیت سے انہیں اردو کا باخبر اسکالر ہونا چاہئے۔ لیکن اس حیثیت سے قطع نظر وہ اپنے فطری میلانِ تحقیق و انتقاد کی بنا پر بھی بڑے اچھے ناقد و محقق ہیں اور اسی لئے محدود یونیورسٹی سے باہر ملک کے دوسرے علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کا خاص مقام متعین ہو چکا ہے۔

تعلیمی اداروں کے اساتذہ عموماً اپنے فرائض کے محدود دائرہ سے بہت کم باہر نکلتے ہیں لیکن فرمان صاحب کا شمار ایسے پرستہ و پُشتکستہ اساتذہ میں نہیں ہے۔ جب وہ یونیورسٹی سے متعلق نہیں تھے اس وقت بھی اردو کے دلدادہ تھے۔ اور یہ کتاب حمدان کے پندرہ انتقادی مقالات کا مجموعہ جو اسی دور کی یادگار ہے۔ پہلا مضمون ”رسم خط“ سے تعلق رکھتا ہے جو پروفیسر افتخار حسین صاحب کے مقالہ پر ایک غائر تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے غالب، درد، فراق کی بعض شعری دفتی خصوصیات پر گفتگو کی ہے جو نہ صرف پر لطف بلکہ حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ اسی طرح انشا کی رانی کیشی، آزاد کی تیشل نگاری، فارسی کی پہلی شاعرہ رابعہ، خطباتِ عبدالحق اور اوزان رباعی برائے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت دلچسپ و معقول دلائل پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں ان کا ایک مقالہ ”علاقائی زبانیں اور اردو ادب“ مقامی مسائل ادب سے تعلق رکھتا ہے اور بڑے مفید مشوروں پر مشتمل ہے جناب فرمان کی مقالہ نگاری کی خصوصیت اس کی سلاست و روانی ہے، وہ جانتے ہیں کہ تحقیقی و انتقادی مقالوں کی زبان کیسی ہونی چاہیے اور ادب لایا استدلال کو کتنا قریب الفہم۔ وہ صرف کام کی باتیں کرتے ہیں اور اسی زبان میں جسے سب لوگ بہ آسانی سمجھ سکیں۔ اور یہ خصوصیت ان کی تمام دوسری تصانیف میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت چار روپیہ ہے۔

_____ ملنے کا پتہ ۱۱۱، سلطان حسین اینڈ سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی

(۲) مشتاق بہک ڈپو۔ شلڈن روڈ۔ کراچی

(۳) نگار پاکستان ۳۲ کارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

نگار پاکستان کا خاص شمارہ

مصحفی نمبر

جس میں اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام بہدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، انکی ابتدائی تعلیم و تربیت، انکی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء انکی تالیف و تصانیف، انکی غزل گوئی و شنوی نگاری۔ ان کے معاصر شعراء و ادباء اور انکے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اسمیں مولانا نیاز فتحپوری کے متعدد مقالوں کے علاوہ دوسرے معروف نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ غرض مصحفی کی تذکرہ نگاری شخصیت اور شاعری کے متعلق سارے مباحث اس خاص نمبر میں اس قدر حسن و ترتیب و مؤرخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ مصحفی کو سمجھنے کیلئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قیمت: تین روپے - 3/-

ادارہ ادب عالیہ - کراچی - ۱۸

غیر ضروری اور فاضل اخراجات کو روک کر بچائی ہوئی رقم

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

میں جمع کیجئے

ایک سینکڑ بنک اکاؤنٹ صرف پانچ روپے سے بھی کھلوا سکتے اور
اعلیٰ درجہ کی بنکاری خدمات سے پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

آج ہی آپ

ہماری کسی بھی شاخ میں اپنا اکاؤنٹ کھولنے اور
ہماری معیاری خدمات سے فائدہ اٹھائیے

یاد رکھئے اسٹینڈرڈ اعلیٰ معیار خدمت کا نام ہے

اے میٹھین
جنرل منیجر

ہیڈ آفس
محمدی ہاؤس - کراچی

ڈیو

ٹائلٹ صابن

لطیف اور معطر

ڈیو ٹائلٹ صابن کی بھنی بھنی مسوڑکن خوشبو نے بیشتر خواتین و حضرات کو اپنا گریدہ بنالیا ہے۔ اس کے لطیف اور پکے جھاگ آپ کی جلد کو رشیم کی طرح ملائم اور صاف ستھرا رکھنے کے علاوہ دیرپا تازگی اور فرحت بخشتے ہیں۔ آپ بھی ڈیو ٹائلٹ صابن آزمائیے۔



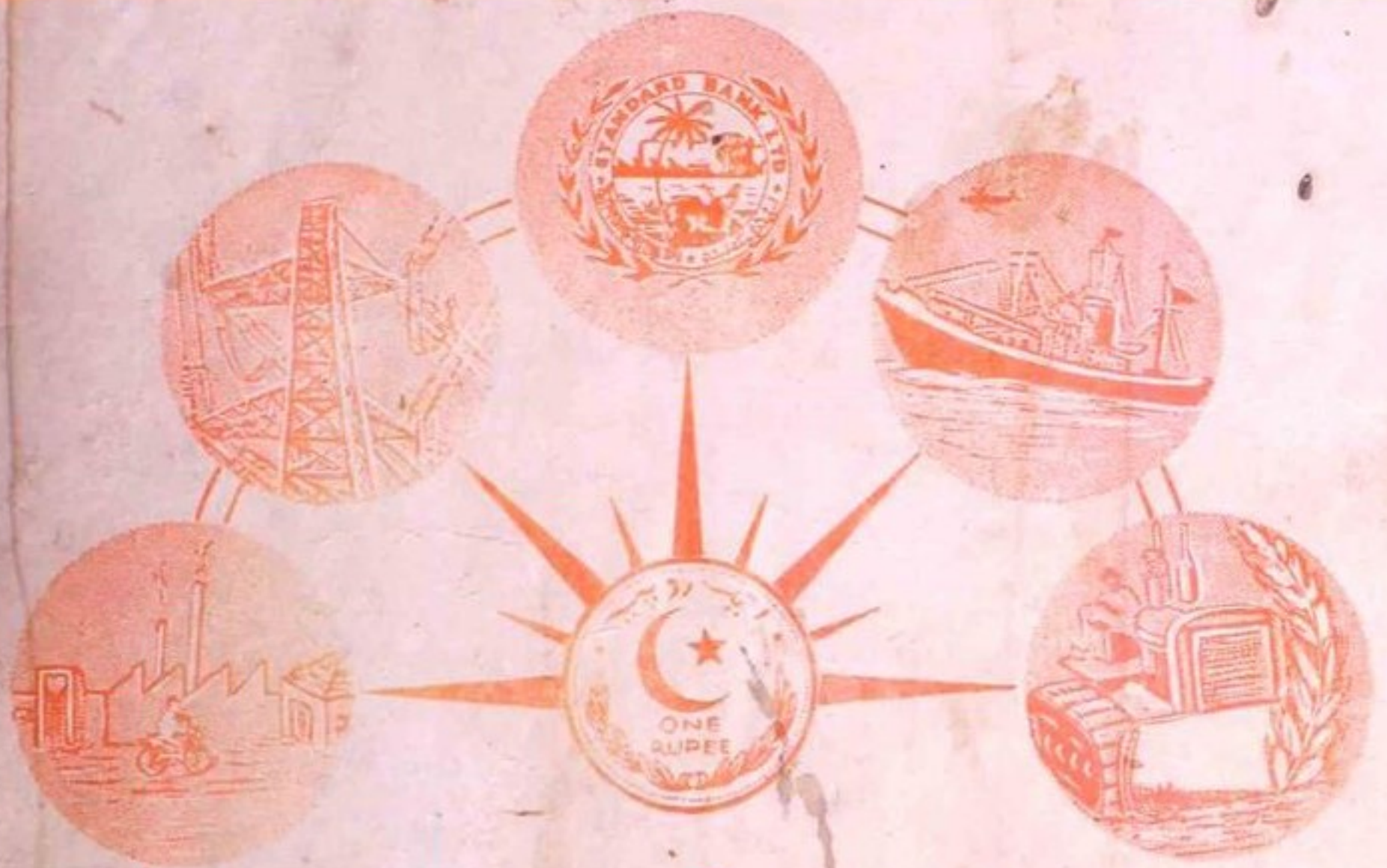
قیمت ۲۰ پیسے

ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے اسے چمکدار پن میں ہمیشہ کیا گیا ہے!

فیروز سنٹر

لیباریٹر نیلیٹڈ
نوشہرہ، مخدنی پاکستان





ساری اقتصادی ترقی

دولت ہی کی مرہون منت ہوتی ہے

پاکستان اقتصادی ترقی کی دوڑ میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اس رفتار ترقی میں اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ بھلائی کے اعانت اور خدمت کا نہایت ہی اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ کی ملک کے دونوں بازاروں میں پھیلی ہوئی
۲۶ شاخیں

میں جہاں بینکنگ سے متعلق ہر قسم کے کاروبار بشمول زر مبادلہ با حسن انجام دیئے جاتے ہیں۔

پانچ مزید شاخیں انشاء اللہ عنقریب — ہی مغربی پاکستان میں منٹگمری اور جھلم اور مشرقی پاکستان میں نرائن گنج، گھٹن اور موتی جھیل ڈھاکہ میں کھل رہی ہیں۔

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: محمدی ہاؤس میکلوڈ روڈ - کراچی